معیار

ہفت روزہ

کہکشاں

کراچی

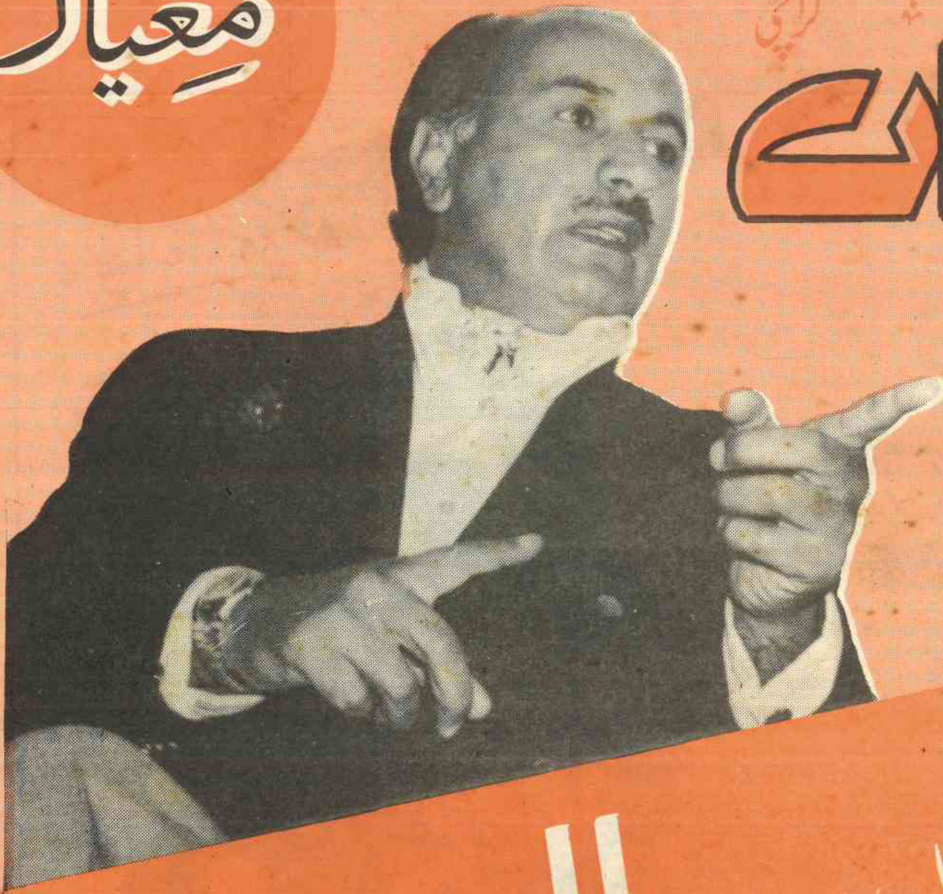

قیمت: چار روپے

نورانی اور اصغر خان — نیا لہجہ، نئی زبان

پنجاب کی جہنم نما جیلوں میں "سب اچھا ہے"

رہا ہونیوالے صحافیوں کی آپ بیتیاں!

معیار پبلیکیشنز کی ایک معیاری پیش کش

جون ۱۹۷۸ء

کا

ٹوٹ بٹوٹ

شائع ہوگیا

پیاری پیاری ہنستی مسکراتی رنگین کہانیاں

- دو سچے خواب
- ایک کوڑی اور مکاٹو
- سوکھا پیڑ
- شاداب نگر کی شہزادی (سلسلہ وار ناول)
- موٹا راجہ
- چالاک بیوی
- بچوں کے حقوق

اور

- میٹھی میٹھی دل نشیں نظمیں
- چلبلاتے، گدگداتے کارٹون
- سرورق: چمکتے دمکتے آرٹ پیپر پر
- سارے صفحے دو سے زیادہ رنگوں میں،

مستقل عنوانات

بچوں کی دعا...... مجھے شکایت ہے ......
وہ آئی ہنسی ..... میں بڑا ہو کر کیا بنوں گا........
بوجھو تو جانیں...... بچی پکی دوستی...... آپ پوچھیں
ہم بتائیں...... ٹوٹ بٹوٹ کی محفل

قیمت ۴ روپے

جنرل منیجر:
ماہنامہ ٹوٹ بٹوٹ پوسٹ بکس: ۳۱۹۵، کراچی ۲۹

کہکشاں

ہفت روزہ

کراچی

جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۲۵

۱۷ تا ۲۴ جون ۱۹۷۸ء

معیار پبلیکیشنز

معیار

اس شمارے میں

چین کے نائب وزیراعظم کا دورۂ پاکستان

ایک اہم قدم ۵-۶

ایپنک اور پی ایف یو جے کی جانب سے

مفاہمانہ اظہار ۷-۸

اہل قلم داستانِ اسیری کی

روداد بیان کرتے ہیں ۲۱-۲۸

چیف ایڈیٹر

محمود شام

ایگزیکٹو ایڈیٹر

اشرف شاد

شعبہ ادارت

عالمی امور — رفیع احمد فدائی

ملکی امور — مجاہد بریلوی

شہناز احمد

نمائندے

حیدر آباد — حسن کامران

اسلام آباد — ضمیر نفیس

لاہور — خیکاف

پشاور — ثناء اللہ

مظفر آباد — جی ایم مفتی

ملتان — قسور سعید مرزا

فیصل آباد — خالد عباس سیف

کوئٹہ — چشتی مجاہد

خط و کتابت کے وقت لفافے پر متعلقہ شعبے کا نام ضرور درج کیجیے

بدل اشتراک

پاکستان میں بذریعہ معمولی ڈاک

قیمت فی کاپی ——— ۳ روپے

سالانہ	۵۲ شمارے	۱۴۰ روپے
ششماہی	۲۶ شمارے	۷۵ روپے

بذریعہ ہوائی ڈاک:

انگلستان، ڈنمارک، ناروے، فرانس، مغربی جرمنی، سویڈن، اٹلی، سوئزرلینڈ، اسپین (یورپ) اور ایشیا میں: جاپان، ملائیشیا، سنگاپور، ہانگ کانگ، چین،

سالانہ	۵۲ شمارے	۳۸۰ روپے
ششماہی	۲۶ شمارے	۱۹۵ روپے

ایران، عراق، سعودی عرب، کویت، سری لنکا، نیپال،

سالانہ	۵۲ شمارے	۱۳۵ روپے
ششماہی	۲۶ شمارے	۱۲۳ روپے

ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کناڈا،

سالانہ	۵۲ شمارے	۶۱۵ روپے
ششماہی	۲۶ شمارے	۳۱۵ روپے

آسٹریلیا، نیوزی لینڈ،

سالانہ	۵۲ شمارے	۵۲۵ روپے
ششماہی	۲۶ شمارے	۲۸۰ روپے

دوبی، ابوظہبی، افغانستان، بحرین، مسقط، قطر، شارجہ،

سالانہ	۵۲ شمارے	۲۴۵ روپے
ششماہی	۲۶ شمارے	۱۳۸ روپے

دفتر رابطہ:

معیار پبلیکیشنز، پوسٹ بکس ۳۱۹۵

۱۹۰-سی، بلاک ۲، پی ای سی ایچ ایس، کراچی ۲۹

تلوار کی نوک پر

بے شمار مشکلات کے باوجود آپ جس لگن اور محنت سے بحالیٔ جمہوریت کے لئے لکھ رہے ہیں وہ واقعی اس بات کا ثبوت ہے کہ حق پسند لوگ سچی باتیں تلوار کی نوک پر بھی لکھنے سے نہیں کتراتے، مالی پریشانیوں کے پیشِ نظر آپ پرچے کی قیمت بے شک زیادہ سے زیادہ کر دیں ہم جیسے قارئین کے لئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ پڑھنے سے محبت اور اچھی سوچ رکھنے والا ذہن قیمت کو کبھی نہیں سوچتا ایک ایک فقرے کی جتنی بھی قیمت لگا دی جائے کم ہے

(شہزاد شیروانی - راولپنڈی)

"شو بوائے"

ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور کے ایک حالیہ شمارے کے اداریئے میں مولانا آزاد کی شان اور مرتبہ بیان کرتے ہوئے یہ فقرہ بھی دیکھنے میں آیا۔

"ان کے کم ظرف مخالفین نے انہیں طرح طرح کی گالیاں دیں۔ حتیٰ کہ "شو بوائے" تک کہا۔"

اداریہ نگار کو شاید معلوم ہوگا کہ مولانا آزاد کو "شو بوائے" کہنے والے صرف قائد اعظم تھے۔ انہوں نے ہی ایک مرتبہ یہ لفظ استعمال کیا تھا ان کے سوا اور کسی نے نہیں ایسی حالت میں کیا اداریہ نگار سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ کسے "شو بوائے" کہہ رہا ہے؟

(آغا امیر حسین - لاہور)

گرانی اور جرائم

ہمارے علاقے میں ان دنوں آٹے کی سخت قلت ہے ناچار ہمیں چاول کھا کر گذر کرنا پڑ رہا ہے کہیں اگر آٹا ملتا بھی ہے تو چار یا پانچ روپے سیر سے کم نہیں لیکن ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے روزانہ یہی کہا جاتا ہے کہ اتنے ٹن گندم ملک میں پہنچ چکی ہے ہم حیران ہیں کہ آخر یہ گندم جاتی کہاں ہے؟

لاقانونیت کے واقعات میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اب تو کسی شخص کی بھی جان، مال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں معلوم ہوتی دن دھاڑے لوٹ مار کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے جرائم کی رفتار اس قدر سنگین ہونے کے باوجود حکام بالکل لاپرواہ ہیں حکام خاموش اور مجرم چور، ڈاکو بے لگام ہیں آخر اس کا انجام کیا ہوگا؟

(سجاد حسین قریشی - کوہاٹ)

ایک شکایت

آپ کا معیار مجھے بے حد پسند ہے لیکن ایک شکایت بھی ہے اور وہ شکایت ہے صفحات کی کمی کی اگر ہو سکے تو اس شکایت کا ازالہ کر دیں۔

(لیاقت علی جاوید گوبھٹ چودھری قریں محمد نگر یو)

شہناز شیخ

"معیار" باقاعدگی سے اور بڑے شوق سے پڑھتی ہوں اس میں عبدالوحید حسینی کی وہ تحریر بھی پڑھی جس میں وہ کہتے ہیں کہ "شہناز شیخ اب کھیل نہیں سکتے" یہ پڑھ کر سخت حیرت ہوئی انہوں نے یہ بات کیسے لکھ دی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید انہوں نے ٹی وی پر میچ نہیں دیکھے ورنہ ایسا تو ہرگز نہ لکھتے شہناز شیخ نے ان میچوں میں جس اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے اس سے بھلا کوئی کیونکر انکار کر سکتا ہے پھر اس ٹورنامنٹ میں سب سے زیادہ گول اسکور کرنے والا بھی شہناز ہی تھا حقیقت یہ ہے کہ شہناز میں اب بھی اعلیٰ اور معیاری کھیل پیش کرنے کی صلاحیت موجود ہے امید ہے حسینی صاحب آئندہ لکھتے ہوئے سوچ سمجھ کر حقیقت پیش کیا کریں گے۔

(کوثر جبیں - مردان - صوبہ سرحد)

مولانا کوثر نیازی اور وڈیرے

جو لوگ ہر دور میں کرسی کے پجاری رہے ہیں ان کا بھٹو صاحب سے کوئی لگاؤ نہیں۔ ان کا کوئی دین ایمان بھی نہیں ہے مگر آپ کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتی ہوں کہ اس مشکل دور میں بھی بڑی بے باکی کے ساتھ عوام کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ خبر میں نے معیار ہی میں پڑھی کہ مولانا کوثر نیازی نے ٹنڈو الہ یار میں پیپلز پارٹی کے وڈیروں سے خفیہ ملاقاتیں کیں مولانا صاحب وڈیروں سے ملنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں وہ وڈیروں کے ہیں اور وڈیرے ان کے۔ ان کا عوام سے کیا ناطہ؟ بھٹو کا دور تھا تو یہ بھٹو کے ساتھ تھے اور اب دوسروں کا دور آ رہا ہے تو یہ بھی انہیں کے ساتھ مل رہے ہیں یہی ان کی فطرت ہے یہ اس کے برعکس کیونکر کر سکتے ہیں یہی حال رانا چندر سنگھ کا بھی ہے۔ یہ بھی ہر دور میں اقلیت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے حاکم وقت کے آگے زمیں بوس ہو جاتے ہیں۔

(مسز لکشمی - تھر پارکر)

"نام نہاد بڑے اخبار" کی پالیسی

پاکستان کے ایک نام نہاد بڑے اخبار کی پالیسی یہ ہے کہ بیگم نصرت بھٹو وغیرہ کے بیانات یہ کہہ کر نہیں چھاپتا کہ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی ہے جب کہ مولانا کوثر نیازی اور دوسرے لوگوں کے بیانات نمایاں طور پر شائع کرتا ہے کیا یہ پابندی کی خلاف ورزی نہیں یا سیاسی سرگرمیوں پر پابندی صرف بھٹو خاندان کے لئے ہے باقی سارے لوگ آزاد ہیں؟ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ جب تحریک استقلال قومی اتحاد سے الگ ہوئی تھی اس وقت کوئی شور نہیں مچایا گیا تھا لیکن مولانا کوثر نیازی کی پیپلز پارٹی سے علیحدگی پر نہ صرف یہ "بڑا اخبار" ہی بلکہ سارے چھٹے پٹے اسے خوب خوب اچھال رہے ہیں۔ آخر میں میں یہی کہوں گا کہ اس نام نہاد بڑے اخبار کے ایڈیٹر صاحب پاکستان کے عوام میں رسوائی سے بچ سکتے ہیں لیکن خدا کے سامنے کیا جواب دیں گے؟

(سید ساجد علی شاہ - حیدر آباد)

محمود شام

چین کے نائب وزیر اعظم کا دورۂ پاکستان، ایک اہم قدم

۱۹۷۸-۷۹ء کے بجٹ میں ۸۰۰ کروڑ روپے کے خسارے کی مالیات کی خبر

چین کے نائب وزیر اعظم۔ ایک بڑے وفد کے ساتھ پاکستان کے دورے پر آئے ہیں۔ وہ پاکستان اور چین کے درمیان خشکی کے ایک اہم راستے شاہراہِ قراقرم کے افتتاح کے لئے تشریف لائے ہیں۔ شاہراہِ قراقرم پاکستان اور چین کے درمیان دوستی کی ایک تاریخی یادگار ہے۔ اس شاہراہ کی تعمیر پاکستانی اور چینی ماہرین، انجینئروں اور مزدوروں کی مشترکہ محنت کا نتیجہ ہے۔ اور یہ پاکستان اور چین کے درمیان دوستی کی ایک ابدی علامت بن کر قائم رہے گی یہ ملکوں کے درمیان دوستی۔ شخصیات کی مرہونِ منت نہیں ہوتی، لیکن شخصیات اس بین المملکتی دوستی کو زیادہ سودمند زیادہ فعال، اور زیادہ کارآمد بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ چین سے دوستی کو شخصیات کے آئینے میں دیکھنے کے لئے ایوب خان، یحییٰ خان، چیئرمین بھٹو اور جنرل ضیاء کے ادوار میں دیکھ لیجئے۔ چیئرمین بھٹو کا دور ایوب خان اور یحییٰ خان کے دور میں بھی جاری رہا ہے۔ چین کے دورے چیئرمین بھٹو نے جتنی بار کئے ہیں، عظیم چین کے بانی اور آنجہانی رہنما ڈاکٹر چیئرمین ماؤزے تنگ اور وزیر اعظم چو این لائی سے جتنی بار ملاقاتیں مسٹر بھٹو نے کی ہیں، شاید کسی پاکستانی رہنما یا کسی اور عالمی رہنما نے کی ہوں۔ وہ مزاج شناسِ چین بن گئے تھے۔ اپنی صدارت اور وزارتِ عظمیٰ کے دور میں بھی انہوں نے ایک سے زیادہ بار چین کا دورہ کیا۔ یہ اگرچہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مسٹر بھٹو کے اقتدار سے الگ ہو جانے کے بعد چین کے رویئے میں تبدیلی آ گئی ہے لیکن کچھ ایسے حالات و واقعات رونما ہوئے ہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ چین پاکستان سے تعلقات کے ضمن میں اتنی گرمجوشی روا نہیں رکھ رہا تھا۔ انہی دنوں میں چین نے ہندوستان سے تعلقات بہتر کرنے میں تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا۔ اور پاکستان کو خصوصی حیثیت دینے کی بجائے بہت سے دوسرے ملکوں کے ساتھ شمار کرنا شروع کیا۔ چین کے وزراء دورے پر نکلتے ہیں تو پاکستان کو بنگلہ دیش، بھارت اور سری لنکا کے ساتھ نمٹاتے ہیں۔ چین کے وزیر اعظم برما اور نیپال میں بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر کرنے کے لئے بے تابی ظاہر کرتے ہیں۔

ان واقعات نے یہ کیفیت پیدا کی تھی کہ شاید چین پاکستان کو اب بالکل ہی نظر انداز کر رہا ہے۔ لیکن اب چین کے نائب وزیر اعظم کا ایک بڑا وفد لے کر پاکستان آنا۔ ان تمام تاثرات کی نفی کرتا ہے جو پاکستان کے لئے خوش آئند ہے اور اطمینان بخش بھی کہ اس کا ایک عظیم اور قدیم دوست اب بھی پاکستان کو اسی محبت سے دیکھتا ہے۔ لیکن اس کے لئے حالات و واقعات کی ترتیب ذہن میں رہنی چاہئے۔ یہاں معاملہ صرف چین اور پاکستان کے درمیان دو طرفہ تعلقات کا نہیں ہے۔ اس میں کچھ آس پاس کے علاقوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا عمل دخل بھی ہے۔ افغانستان میں انقلاب۔ اس خطے کے لئے ہی نہیں بلکہ تینوں سپر طاقتوں۔ امریکہ۔ روس اور چین کے لئے اپنی عالمی حکمتِ عملی میں فوری تبدیلیوں کا محرک بنا ہے۔ چین امریکہ دونوں کے لئے اب پاکستان کی اہمیت پھر بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ روس اور اس کا کمیونزم ایک طرف۔ پاکستان میں بلوچستان اور سرحد کے لئے کئی ہزار میل طویل بارڈر تک پہنچ گیا ہے۔ ادھر ایران کی سرحد پر دستک دے رہا ہے۔ خشکی میں گھرے ہوئے افغانستان کو اب تک بفر سٹیٹ سمجھ کر سب مطمئن رہتے تھے لیکن اب وہاں حکمرانوں کے نئے لہجے اور نئے عزائم دیکھ کر مغربی ڈپلومیٹ مختلف تاویلات کرنے لگے ہیں کہ یہ ایشیائی کیوبا بن گیا ہے تو اس کا ایشیائی امریکہ کون ہے پاکستان اور ایران میں تو اتنی سکت نہیں ہے۔ کچھ ڈپلومیٹوں کا کہنا یہ ہے کہ روس اب افغانستان میں کسی دوسری تبدیلی کو برداشت نہیں کرے گا۔ اگر

ایسا ہوا تو وہ ہنگری اور چیکوسلواکیہ کی طرح اقدامات کرے گا۔ افغانستان کے نئے حکمران جتنی تیزی سے انقلاب کی منزل تک بڑھ رہے ہیں۔ وہ آس پاس کے ممالک کے لئے کافی خطرناک ہے۔ وہ افغانستان کو مختلف اللسانی قومیتوں کی بنیاد پر جمہوریتوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ ان کا نیا دستور روس کے دستور سے ملتا جلتا ہوگا جس میں شامل تمام ریاستوں کو اپنی مرضی سے علیحدہ ہونے کا حق حاصل ہے۔ اس اقدام کے اثرات پاکستان پر ضرور مرتب ہوں گے۔

چین خود کمیونسٹ ہے لیکن روس کے حلقۂ اثر میں توسیع اس کے لئے یقیناً پریشان کن ہے کیونکہ آج کل چین روس کو اپنا سب سے بڑا نظریاتی اور علاقائی حریف سمجھتا ہے۔ اس کے ذرائع ابلاغ امریکہ کی آج کل مذمت نہیں کرتے، ان کا سارا زور روس کی مذمت میں صرف ہوتا ہے۔ روس کے ساتھ چین کی یہ کشمکش دنیا میں ہر سطح پر نظر آتی ہے سفارتی میدان میں، تجارتی میدان میں، سرحدی تنازعات میں۔ اس سے فائدہ بلاشبہ امریکہ کو پہنچ رہا ہے لیکن حال ہی میں سفارتی جارحیت میں روس آگے نکلا ہے مشرقِ وسطیٰ میں، افریقہ میں اسے واضح کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ اس کی تازہ ترین فتح افغانستان میں ہوئی ہے۔ افغانستان میں اس انقلاب کی ضرورت عوام بھی محسوس کر رہے تھے۔ اس لئے اسے عوام کی تائید بھی حاصل ہو گئی ہے۔

چین کے نائب وزیر اعظم کا دورۂ پاکستان۔ اور چین کے وزیر خارجہ کا دورۂ ایران۔ دو طرفہ تعلقات، کی بہتری کے لئے تو ہے ہی، لیکن ان میں افغانستان کا انقلاب۔ نقطۂ مرکزی ہوگا۔ ایران تو اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ کمیونزم کی یلغار روکنے کے لئے پاکستان میں ایسی سیاسی حکومت کا فوری قیام ناگزیر ہے جس کی جڑیں عوام میں ہوں، اور جو کمیونسٹوں کے لئے کسی حد تک قابلِ قبول ہو۔ فوجی حکومت یا خالص مذہبی حکومت چونکہ ملک کے مسائل کو جدید انداز اور ترقی پسندانہ فکر سے حل نہیں کر سکتی، اس لئے وہ کمیونزم کے لئے راستہ تیزی سے ہموار کر سکتی ہے۔ افغانستان کے انقلاب کے بعد شہنشاہ ایران کی طرف سے بھٹو کی رہائی کے لئے تجاویز اور بار بار اعادہ اس اندازِ فکر کی غمازی کرتا ہے۔ بھٹو کو اگرچہ بعض لوگ "معمولی مسئلہ" کہہ کر مطمئن ہو گئے تھے۔ لیکن وہ معاملات کی معروضی پیشرفت سے آنکھیں بند کئے ہوئے تھے۔ حالات کے منطقی نتیجے میں افغانستان کا انقلاب برپا ہوا اور بھٹو پھر ایک اہم بلکہ مرکزی مسئلہ بن گیا ہے۔ "مساوات" نے "نہیں جنگ" اور "ڈان" کے لندن کے نمائندوں نے لکھا ہے کہ دنیا کی دو بڑی جمہوریتوں کے سربراہوں کارٹر اور ڈیسائی کے مذاکرات میں بھی یہ "معمولی مسئلہ" زیر غور آیا۔ اور بی بی سی کہتا ہے کہ چینی وزیر خارجہ کے دورۂ ایران میں بھی یہ معمولی مسئلہ موضوعِ گفتگو ہوگا

آج کل چیئرمین بھٹو کو جیل میں ملنے والی سہولتیں بھی عوام کا موضوع بنی ہوئی ہیں۔ ان معمولی سی سہولتوں سے پہلے چیئرمین بھٹو نے لاہور اور راولپنڈی جیل میں جس اذیت اور تکلیف میں وقت گذارا ہے۔ اتنے بڑے کا کوئی رہنما اور بچپن سے ہی آرام دہ ماحول میں گذارنے والا کوئی اور شخص اگر ان حالات سے دوچار ہوتا، تو اس کے اعصاب کب کے بکھر چکے ہوتے لیکن آہنی اعصاب کا مالک یہ شخص آج بھی اسی طرح حوصلہ مند ہے۔ اور وہ اب بھی اپنی مشکلات پر نہیں پاکستان کو پیش آنے والی مشکلات پر تڑپ اٹھتا ہے۔ اپنی بیگم اور اپنی بیٹی سے ہونے والی ملاقات میں بھی پاکستان کے موجودہ مسائل، عالمی طاقتوں کے رویہ اور اقتصادی حالات پر گفتگو ہوتی رہی ہے۔

بے نظیر بھٹو کی نظر بندی کے خلاف پٹیشن کی

ایک معمولی مسئلہ

کارٹر اور ڈیسائی

کے درمیان زیرِ غور آیا

سماعت کے بعد مسٹر جسٹس فخر الدین جی ابراہیم اور مسٹر جسٹس اجمل میاں پر مشتمل سندھ ہائیکورٹ کے ڈویژن بنچ نے جو تاریخی فیصلہ دیا ہے وہ دوسرے بے شمار نظر بندوں کی آئینی درخواستوں کے سلسلے میں ایک نظیر بن جائے گا۔ فاضل ججوں نے روزانہ سماعت جاری رکھ کر اس پٹیشن کا فیصلہ بھی سات روز کے اندر اندر کر دیا۔ اس وقت ملک کی چاروں عدالت ہائے عالیہ میں نظر بندی کے خلاف کئی آئینی درخواستیں کئی کئی مہینوں سے زیر سماعت ہیں، جو یا تو مقدمات کی کثیر تعداد کے پیش نظر یا ٹیکنیکل وجوہ کی بنا پر فیصلوں سے ہمکنار نہیں ہو سکی ہیں۔

آخر میں کچھ بجٹ کے بارے میں بھی مرکزی بجٹ ۲۹ جون کو پیش ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے چاروں صوبوں کے بجٹ پیش ہوں گے۔ عام طور پر پہلے مرکز کا بجٹ آتا ہے۔ پھر صوبوں کے بجٹ اس کی روشنی میں اور اس میں تفویض کردہ گرانٹوں کی بنیاد پر بنتے ہیں۔ لیکن اب کے تجربہ کچھ الٹ کیا جا رہا ہے۔ بہرحال ملک میں موجود مخصوص حالات کی بنا پر یہ بجٹ بھی غیر معمولی ہوگا۔ ۱۹۷۷ اور ۱۹۷۸ء کا بجٹ بھی خسارے کا بجٹ تھا۔ اور اپریل سے جون ۱۹۷۷ء تک احتجاجی سیاست نے معیشت کا جو حال کیا تھا، اس کے اثرات بجٹ پر پڑے تھے۔ اور پھر جون ۱۹۷۷ء سے جون ۱۹۷۸ء تک حالات جو بے یقینی کے ساتھ گذر رہے ہیں، سیاسی بھی اقتصادی بھی۔ اس کے اثرات ۱۹۷۸ء، ۱۹۷۹ء کے بجٹ پر پڑنا ناگزیر ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ یہ بجٹ بھی خسارے کا بجٹ ہوگا۔ اور خسارہ تقریباً ۸۰۰ کروڑ روپے کا ہے۔ یہ خسارہ ٹیکسوں کے ذریعہ پورا کیا جائے گا۔ اور نوٹ چھاپ کر۔ اس کے بعد افراطِ زر کی شرح کیا ہوگی۔ یہ تو ماہرین معیشت بتائیں گے اب دیکھنا یہ ہے کہ اشیائے تعیش کی درآمد پر پابندی کس حد تک لگتی ہے۔ گاڑیوں کی درآمد ممنوع ہوتی ہے کہ نہیں۔ لیکن پاکستان جیسے ملک میں جہاں معیشت کا سارا دارومدار اب قرضوں اور درآمدات پر

باقی صفحہ ۸ پر

حکومت کو ۲۷ جون تک
مطالبات تسلیم کرنیکی مہلت

پی ایف یو جے اور ایپنک کی طرف سے

مفاہمانہ طرزِ عمل کا اظہار

۲۷ جون پی ایف یو جے اور ایپنک کی مجلسِ عاملہ نے اپنے اجلاس میں مطالبات کی منظوری کے لئے حکومت کو آخری تاریخ دیدی ہے اس کے ساتھ ہی ان اجلاسوں میں اخباری کارکنوں کے اتحاد اور یگانگت کا زبردست جذبہ دیکھنے میں آیا ہے۔ اور اجلاس کے اختتام پر کراچی میں اخباری کارکنوں کا جلسہ پریس کلب کی بجلی کا سلسلہ منقطع ہوجانے کے باوجود رات تک جاری رہا۔ اس کے بعد حیدر آباد میں جو اخباری صنعت کا ایک چھوٹا مرکز ہے تمام اخباری کارکنوں نے پاکستان بھر سے آئے ہوئے رہنماؤں کا خیر مقدم کیا۔ حیدر آباد پریس کلب کا جلسہ بھی اس اعتبار سے اہمیت کا حامل تھا کہ اس میں صحافیوں کی غالب اکثریت شریک تھی جب سے اس سے چند روز قبل پولیس اور انتظامیہ کی سرپرستی میں تنظیم سے نکالے ہوئے افراد نے جلسہ کرنے کی جو کوشش کی تھی اس میں آٹھ سے زیادہ صحافی شریک نہیں ہو سکے تھے

اخباری کارکنوں کی دونوں تنظیموں کے یہ اجلاس اس لئے بھی بہت اہم تھے کہ اس میں آزادی

صحافت کے انتہائی خاص مسئلے، مساحات کراچی، الفتح اور معیار اور برطرف شدہ صحافیوں کی بحالی اور اخباری کارکنوں کے اقتصادی مطالبات منظور کرانے کے لئے لائحۂ عمل مرتب کیا جاتا تھا۔ اس وقت کراچی سے خیبر تک اخباری کارکنوں کی منظم جدوجہد کو دیکھتے ہوئے حکومت اپنے بعض چنیدہ افراد کے ذریعے پی ایف یو جے اور ایپنک کی متوازی تنظیمیں قائم کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے اس کے مقابلے میں ملک بھر کے اخباری کارکنوں کے اتحاد کو مضبوط کرنے کے لئے ان اجلاسوں میں اہم فیصلے بھی کئے گئے تاکہ مستقبل میں تحریک شروع کرنے سے قبل تنظیموں کو تخریبی عناصر سے مکمل طور پر پاک کیا جا سکے۔ ایف ای سی اور این ای سی (مجالس عاملہ) کے اجلاسوں نے ان دونوں معاملات پر طویل غور و خوض کے بعد بڑے دو ٹوک فیصلے کئے ہیں۔

۲۷ جون ۱۹۷۸ء کی تاریخ مقرر کی گئی ہے اور حکومت کو مطالبات کا چارٹر دیا گیا ہے کہ اس عرصے تک یہ مطالبات باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے تسلیم کر لئے جائیں، اخباری کارکنوں کی تنظیموں کے اصلی نمائندوں سے مذاکرات کئے جائیں اور اگر مقررہ تاریخ تک یہ باتیں خوش اسلوبی سے طے نہ کی گئیں تو پھر اخباری کارکن اپنی قوتوں کو اس عرصے میں مجتمع کر کے عملی اقدامات شروع کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ یہ عملی اقدامات کیا ہوں گے، اس کا فیصلہ ۱۲ رکنی مرکزی مجلسِ عاملہ کرے گی۔ جو ان اجلاسوں میں مقرر کی گئی ہے۔ اخباری کارکن اپنی تحریک کے مقاصد سے پوری اخباری صنعت کو آگاہ کرنے کے لئے ۱۰ جون سے ۲۴ جون تک ہفتۂ احتجاج منائیں گے۔ مزدور اور طلباء اس پوری جدوجہد میں اس مرتبہ عملی طور پر اخباری صنعت کے کارکنوں کے شانہ بشانہ ہوں گے، اس مسئلے کے لئے ایک SOLIDARITY کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس نے صحافیوں کی تحریک کے ممکنہ آغاز کے لئے کام شروع کر دیا ہے۔

حکومت کو ۲۷ جون تک کی ایک بار پھر جو مدت دی گئی ہے وہ پی ایف یو جے اور ایپنک کے مفاہمانہ طرزِ عمل کا ایک اور اظہار ہے اور اب اس مرتبہ حکومت کو اور وزارت اطلاعات میں کام کرنے والے اس کے "ربڑ وں" کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ صورتحال کا جائزہ لینا چاہئے اگر یہ تنظیمیں دوبارہ ۳۰ اپریل کی صورت حال پر پہنچ گئیں تو حکومت اور پریس کے تعلقات ایک بار پھر کشیدگی کی انتہا کو پہنچ جائیں گے۔ جو حکومت اور ملک دونوں کے مفاد میں نہیں ہے۔ حکومت اس عرصہ میں یہ اندازہ کر چکی ہو گی کہ صحافیوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں مشقت لینے سے انہیں کوڑے مارنے یا نوکریوں سے برطرف کرنے کے حربوں سے وہ ان کی تحریک کو روک نہیں سکتی بلکہ جبر کے یہ طریقے تحریک کی شدت میں اور اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ اس طرح ان لوگوں کی حقیقت بھی اس پر واضح ہو گئی ہو گی جو اخباری تنظیموں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر کے اتحاد کو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ ان عناصر کو سرکاری اخبارات اور ریڈیو ٹی وی کے ذریعے تشہیر دے کر بیساکھیاں تو دی جا سکتی ہیں لیکن ماضی کی طرح متوازی یونینیں کبھی اصلی قیادت کے سامنے ٹھہر نہیں سکی ہیں۔ اخباری کارکنوں کی غالب اور واضح اکثریت اپنے اصلی رہنماؤں کو پہچانتی ہے اور ان کی قیادت میں متحد و منظم ہے۔

حکومت اگر ۲۷ جون سے پہلے پی ایف یو جے اور ایپنک کے رہنماؤں سے ان کے جائز مطالبات پر بات چیت کر کے کسی تصفیے پر پہنچنے کی کوشش کرتی ہے تو حکومت کی طرف سے یہ خیر سگالی کا ایک ایسا مظاہرہ ہو گا جس کے ذریعے ماضی کی تلخیاں ختم ہو سکیں گی۔ ان تنظیموں کو جن کا ماضی جدوجہد سے عبارت ہے، اور جنہوں نے ہر عہد میں قربانیوں کی مشعلیں جلائی ہیں اگر ایک بار پھر تحریک چلانے کے لئے باہر نکلنے پر مجبور کیا گیا تو یہ ہم سب کی ایک اور بدقسمتی ہو گی۔

بقیہ
صورت حال

بے نظیر بھٹو کی
نظر بندی کو غیر قانونی
قرار دینے کا تاریخی فیصلہ

ہو گیا ہے۔ زرعی ملک ہونے کے باوجود یہاں کروڑوں روپے کا خشک دودھ درآمد کیا جا رہا ہے۔ اس کی معیشت میں توازن اور منصوبہ بندی کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

اصل فکر کی بات یہ ہو گی کہ پاکستان سٹیل ملز، انڈس ہائی وے اور چشمہ ایٹمی پلانٹ جیسے منصوبے جن سے ہمارے مستقبل کا اقتصادی استحکام اور خود کفالت وابستہ ہے۔ ان کی پیشرفت کا کیا بنتا ہے کیونکہ گذشتہ ڈیڑھ سال میں ان منصوبوں میں اتنی ترقی نہیں ہوئی، جو شیڈول کے مطابق ہونی چاہئے تھی، بیرونی قرضوں کی ادائیگی۔ اور مزید قرضوں کا حصول بھی قابلِ غور ہو گا۔

بجٹ سے پہلے پہلے سول حکومت کا قیام بھی متوقع ہے۔ شہری حکومت کا تصور منتخب حکومت کا ہوتا ہے۔ لیکن اب لگتا ہے کہ حکومت میں یونیفارم میں ملبوس وزیر بھی ہوں گے۔ اور شہری لباس والے بھی۔ کچھ فوجی دماغ اور کچھ سیاسی دماغ۔ کاروبارِ مملکت ان کی نگرانی میں چلے گا۔ یہ الگ بات کہ ہوں گے دونوں ہی غیر نمائندہ۔ عوام کی رائے تو حاصل نہیں کی جا رہی ہے۔ عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے دیکھیں کیا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔

پیرس کے جریدے

لے موندے

کے ایتین جاڈل کا مکتوب

بھٹو

کو صرف بین الاقوامی رائے عامہ ہی بچا سکتی ہے

عام قانونی ریکارڈوں میں ایسا کم ہی دیکھا جاتا ہے کہ آبادی کی ایک بڑی اکثریت کے ذریعہ منتخب کردہ وزیراعظم کو اس کی فوج کا سربراہ معزول کر دے اور عدالت اسے قتل عمد کے لئے سزائے موت سنا دے۔

اور عام قوانین کے مطابق کام کرنے والی ایک فوجداری عدالت کا یہ عمل اس وقت اور بھی انوکھی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے جب اس کی تہمیں ایک ایسے ملک میں کھلتی ہیں جہاں مارشل لاء نافذ ہے جہاں فوجی عدالتیں سرسری کارروائیوں کے بعد حکومت کے مخالفین اور صحافیوں کو شدید سزائیں دیتی ہیں مزید برآں کوڑے لگانے کا ظالمانہ برتاؤ کیا جاتا ہے

۲۰ مئی سے راولپنڈی میں پاکستان سپریم کورٹ کے نو ججوں کے سامنے اپیل کی سماعت کا اجلاس ہو رہا ہے اور جسے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ بھٹو کو پھانسی دی جائے یا نہیں ... تاوقتیکہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء انہیں معاف نہ کر دیں، اس نے اس وقت ساری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رکھی ہے۔

پاکستانی حکومت، بظاہر اپیل کی کارروائی کو انتہائی باضابطہ صورت میں پیش کرنا چاہتی ہے۔ مقامی اور بین الاقوامی پریس کے نمائندوں کو آج تک آزادانہ طور پر اجلاسوں میں شرکت کا موقع دیا جا رہا ہے۔ عدالتی مبصرین کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے اس طرح مجھے بین الاقوامی وفاق حقوق انساں کے ایک ماہر کی حیثیت سے ۲۰ - ۲۵ مئی تک بلا کسی دشواری کے اعانت حاصل ہوتی رہی۔ مزید برآں پاکستان کے سابق اٹارنی جنرل مسٹر بختیار کے تحت کام کرنے والے مسٹر بھٹو کے وکلاء کے بیانات بھی اسی طرح چھپتے ہیں جس طرح وہ اپنے مؤکل کی سزائے موت سے متعلق لاہور ہائی کورٹ کے ۱۸ مارچ کے فیصلے کے خلاف اپیل کی کارروائی کرتے ہوئے پسند کرتے ہیں۔

یہ آزادی اس حد تک بھی نہیں ہے کہ مجھے راولپنڈی جیل میں مسٹر بھٹو سے ملاقات کی اجازت مل جائے جہاں انہیں مقدمے کی مدت تک کے لئے

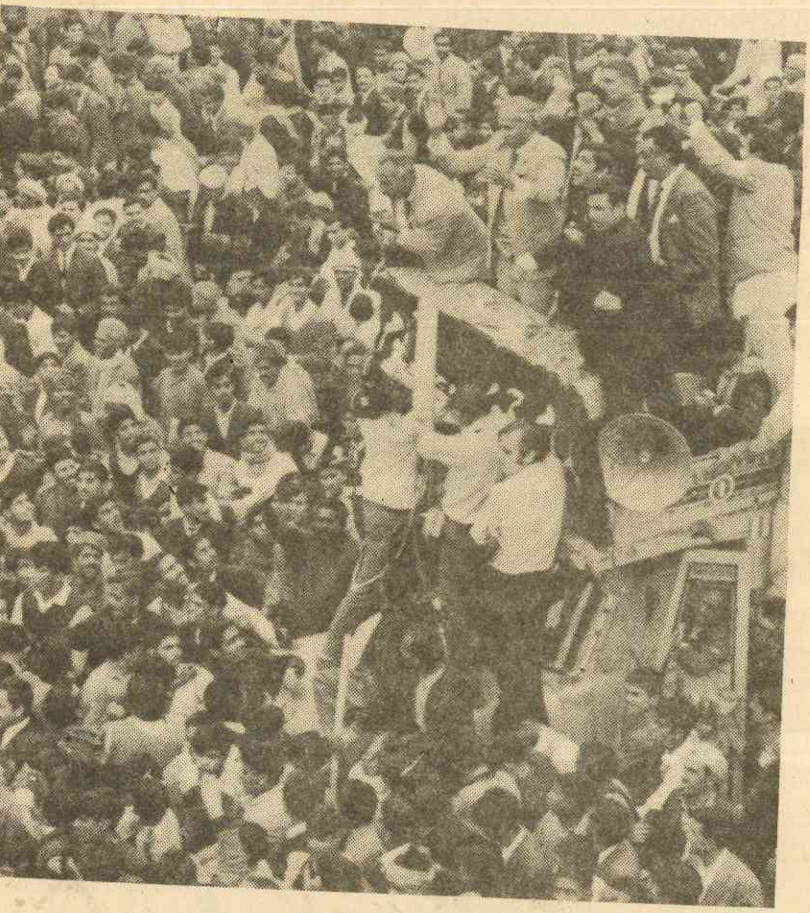

منتقل کیا گیا ہے۔ اور اس ضرورت کے تحت ان وکلاء سے رابطہ قائم کر سکوں اس لئے کہ اب تک انہیں (مسٹر بھٹو کو) اجلاس میں شرکت کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ یہ قطعی واضح ہے کہ پاکستانی حکام، بہر قیمت، عدالت کے اجلاس کو عام قوانین کی شکل میں پیش کرنا چاہتے ہیں کیونکہ سابق وزیر اعظم شروع ہی سے یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ انہیں جس سزا کا مستوجب قرار دیا گیا ہے وہ سیاسی نوعیت کی ہے اور انہیں جن حالات کا شکار رکھا گیا ہے وہ عام قوانین کے برعکس ہے۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فرد جرم عائد ہونے کے بعد مسٹر بھٹو کو رہا کر دیا گیا تھا تاہم کئی دنوں کے بعد انہیں مارشل لاء کے تحت دوبارہ حراست میں لے لیا گیا۔

اگر عدالتی کارروائی کی یہ ظاہری بے ضابطگی

آنے والے دو ماہ تک برقرار رہتی ہے

کارروائی شروع دن سے جن حالات سے گذری ہے لاہور ہائیکورٹ کے صدر نے مسٹر بھٹو کے وکیل مسٹر اعوان اور خود ملزم پر جس طرح حملے کئے ہیں وکلاء صفائی اب ان سے ملزم کے دفاع کا کام لے رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس مقدمے کی کارروائی کا ایک اہم حصہ بند کمرے میں ہوا پھر فیصلے میں سابق وزیر اعظم کو ایک "عادی جھوٹا"، ایک "خراب مسلمان" "وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہونے کا نا اہل" وغیرہ جو کہا گیا ہے وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ فیصلہ اصلاح طلب ہے۔

اسی طرح وکلاء یہ بھی کہتے ہیں کہ اجلاس میں دیا جانے والا بیان نامکمل ہے۔ کیونکہ وہ چند اہم نکات سے متعلق گواہوں سے سوالات نہ کر سکے۔ یہ سوال غیر متعلق ہے کہ سیکیورٹی فورس کے سابق ڈائرکٹر مسعود محمود کو جو استغاثہ کے خاص گواہ ہیں، حکومت کی تبدیلی کے دن ہی سے حفاظتی حراست میں لے لیا گیا تھا۔ انہیں ان کے اعتراف کے بعد معافی دی گئی جس نے ان کی شہادت کو قطعی مشتبہ بنا دیا انہوں نے وفاقی پولیس فورس کے سابق انسپکٹر جنرل مسٹر رشید کو نئے گواہ کے طور پر حاصل کیا ہے جسے استعمال کرتے ہوئے وہ بحث کے دوران یہ دکھانے کی کوشش کریں گے۔ ان کی حفاظتی نظر بندی کے دوران مارشل لاء حکام نے سابق وزیر اعظم کے خلاف گواہی دینے کے لئے ان پر کس حد تک دباؤ ڈالا تھا۔

پھر بھی یہ خطرہ باقی رہتا ہے کہ سپریم کورٹ یہ طے کرلے کہ سیکیورٹی فورس نے مسٹر بھٹو کے پرانے رفیق کار اور بعد میں سیاسی حریف مسٹر احمد رضا قصوری کی جان لینے کی جو کوشش کی تھی اور جس میں غلطی سے ان کے والد مارے گئے۔ اس کے خاص منصوبہ بند کی حیثیت سے مسٹر بھٹو کو ضرور سزا ملنی چاہیئے۔ سپریم کورٹ کے صدر اور استغاثہ سے ملزم اور ان کے وکلاء کے درمیان جو عداوت پیدا ہو گئی تھی اور پھر ملزم اور ان کے وکلاء نے جو خواہ مخواہ صدر کو ہٹانے کے لئے کہا تھا اس کے بعد دیکھا گیا کہ مسٹر بھٹو کے دندان ساز ڈاکٹر نیازی کو مارشل لاء کے تحت محض اس لئے گرفتار کر لیا گیا کہ انہوں نے لاہور جیل میں اپنے مؤکل کو پیش آنے والی دشواریوں کی طرف حکام کی توجہ مبذول کرائی تھی اور اب انہیں یقیناً یا ان کے وکیل کو ان کی نظر بندی کا سبب بتائے بغیر ایک فوجی ٹریبونل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اب صرف بین الاقوامی رائے عامہ ہی انہیں بچا سکتی ہے کیونکہ ملک کے اندر انہیں حاصل شدہ مقبولیت ان کے کوئی کام نہیں آ سکتی۔ ملک میں مارشل لاء کی حکومت ہے، پریس مکمل طور پر خاموش ہے۔ جہاں ہر قسم کے مظاہرے ممنوع ہیں اور جہاں موجودہ حکومت کے مخالفین کو فوجی حکام گرفتار کر لیتے ہیں۔ اور مارشل لاء کی سرسری عدالتوں میں انصاف کی پیروڈی کے بعد بھاری بھاری سزائیں دی جاتی ہیں جن میں کوڑے مارنے کی سزا بھی ہوتی ہے۔ ●●

اشرف شاد

نورانی اور اصغرخان کا نیا لہجہ ۔ نئی زبان

اصغرخان فوری انتخابات کے مطالبے سے دستبردار نہیں ہونگے

قومی اتحاد اور پیپلز پارٹی کے مذاکرات ناکام کرانیوالے مارشل لائے کے ناقد کیوں بن گئے؟

اصغرخان بھی بالآخر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور الیکشن سیل کے دوسرے ارکان سے مل لئے ، انکی یہ ملاقات رات میں ہوئی اور عشائیے پر جاری رہی ۔ اس طرح ملک کی سیاست میں دوسری بڑی قوت نے اس وقت کے حکام سے دو بدو گفتگو کی یہ گفتگو یقیناً صاف صاف ہوئی ہوگی کیونکہ اصغرخان اپنے وقت کے بہت مضبوط کمانڈر انچیف رہے ہیں ۔ فوج میں ایک طویل وقت گذارنے کے بعد دام سیاست کے اسیر ہوئے تو بھی فوجی لہجہ ان پر غالب رہا ۔ موجودہ حکام بھی فوجی ہیں ۔ ملاقات میں جنرل ضیاء الحق کی معاونت کے لئے جو ارکان موجود تھے وہ بھی مولا بخش سومرو اور اے کے بروہی کو چھوڑ کر سب ایکٹیو یا ریٹائرڈ جنرل تھے ۔ اصغر خان کو انکے لب ولہجہ سے پرانی شناسائی ہے ، اس لئے فوج کے تربیت یافتہ طرفین کی یہ گفتگو "فوجی" انداز میں سیدھی اور صاف ہوئی ہوگی ۔

اصغرخان نے ملاقات کے بعد اخبار نویسوں سے جو بات چیت کی ہے اس سے بعض باتیں بڑی واضح

شاہ احمد نورانی کا سیاسی مستقبل اصغر خان سے وابستہ ہے

ہوتی ہیں۔ انکے مطابق احتساب اس سال کے آخر تک مکمل ہو جائے گا، انتخابات اگلے سال کے وسط میں ہوں گے، بجٹ سے پہلے شہری حکومت قائم ہو جائے گی، سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندیاں ختم کر دی جائیں گی۔ اصغر خان نے موجودہ عبوری حکومت سے یہ یقین دہانیاں حاصل کی ہیں، ان باتوں کے لئے دباؤ ڈال کر انہیں تیار کیا ہے اور یا عبوری حکومت نے پہلے سے کئے گئے اپنے ان فیصلوں سے انہیں آگاہ کیا ہے۔ اس کا اصغر خان کی گفتگو سے اندازہ نہیں ہوتا۔ تاہم انکی اس ملاقات کے بعد غیر یقینی سیاسی صورت حال کے اس موسم میں یہ اندازہ ضرور ہوا ہے کہ عبوری حکومت کی شیڈولنگ کیا ہے۔

اصغر خان سے یہ ملاقات بذاتِ خود ایک اہم خبر کا درجہ رکھتی ہے۔ کہ قومی اتحاد بحیثیت ایک جماعت کے اور انفرادی طور پر اس میں شامل مختلف دوسری جماعتوں کے رہنما گاہ بہ گاہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر یا ان کے رفقائے کار اور الیکشن سیل کے ارکان سے ملتے رہتے ہیں جبکہ اصغر خان اس قسم کی ملاقاتوں گریزاں تھے۔ یہ بات گذشتہ دنوں قدرے تلخی کا باعث بھی بنی تھی جبکہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے قومی حکومت کی تشکیل کے سلسلے میں سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے ملاقاتوں کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس میں اصغر خان نے خود جانے کے بجائے اپنی پارٹی کے سیکریٹری جنرل مشیر احمد پیش امام کو بھیجا تھا اور جناب ضیاء الحق نے ان سے ملاقات سے انکار کر کے یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ اس سطح پر ملاقات کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

اصغر خان کا یہ گریز اب اس وقت ختم ہوا ہے جبکہ قومی اتحاد والے ایک بار پھر عبوری حکومت سے مستقل رابطے میں ہیں، انکا یہ رابطہ خطوط اور ملاقاتوں کی شکل میں جاری ہے۔ لیکن اس ملاقات کے بعد بھی اصغر خان نے ایسی کوئی نشاندہی نہیں کی ہے کہ وہ عبوری حکومت یا اس کے اقدامات سے تعاون کریں گے اور اس کی طرف سے قائم کردہ شہری حکومت کے سلسلے میں ان کی پارٹی کیا رویہ اختیار کرے گی۔ لیکن اس وقت سیاست میں انکے اتحادی جمعیت علمائے پاکستان کے سربراہ شاہ احمد نورانی نے یہ اشارہ ضرور کیا ہے کہ اگر شہری حکومت قائم ہوئی تو اس پر زور دیا جائے گا کہ مارشل لاء اٹھا لیا جائے۔

اصغر خان اور شاہ احمد نورانی نے گذشتہ کچھ عرصے میں اپنی سیاست کا جو رخ متعین کیا ہے وہ لہجے اور زبان کے اعتبار سے انکے سابقہ روّیے کی نسبت خاصا نیا ہے۔ اصغر خان قومی اتحاد کے سربرآوردہ رہنما تھے بلکہ قومی اتحاد میں عوام کے لئے اگر کسی رہنما کی شخصیت کشش انگیز تھی وہ اصغر خان ہی کی شخصیت تھی جس کا قومی اتحاد کے جلسوں اور جلوسوں میں اندازہ ہوتا رہا۔ پھر جب اس وقت کی حکمران جماعت پیپلز پارٹی اور اس کے رہنماؤں سے مذاکرات شروع ہوئے تو مذاکرات کی ناکامی کا سہرا بعد میں اصغر خان نے خود اپنے سر باندھا تھا اور واضح طور پر عام جلسوں میں اس بات کا اعلان بھی کیا تھا کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا سخت رویہ اختیار کیا تھا تاکہ سمجھوتا نہ ہو سکے۔ وہ اس کے لئے جو بھی جواز دیتے ہیں اس سے قطع نظر یہ بات طے شدہ ہے کہ ایسا کرتے وقت اصغر خان کے ذہن میں یہ بات یقیناً رہی ہو گی کہ اب مستقبل فوج کے ہاتھ میں ہے۔ اس سلسلے میں انکے فوج سے کیا رابطے تھے۔ اور ان کا یہ عمل ایک طے شدہ منصوبے کا حصہ تھا یا نہیں۔ اس بحث میں الجھے بغیر اب یہ بات بڑی تعجب خیز نظر آتی ہے کہ موجودہ عبوری حکومت کے سلسلے میں انکی سیاست کا رخ اچانک تبدیل کیوں ہوا تھا۔

یہ قصہ دراصل صرف اتنا نظر آتا ہے کہ بھٹو صاحب کی معزولی کے بعد سیاستدانوں کو عوام کی بے چینیوں کو سمیٹنے اور انکی حمایت حاصل کرنے کے لئے مختلف ادوار میں مختلف ٹھیکے دیئے جاتے رہے اور اصغر خان وہ دوسرا گھوڑا تھے جنہیں انکی انفرادی حیثیت میں آزمایا گیا تھا۔ قومی اتحاد نے ۵ جولائی کے بعد عوام کا اعتماد کھو دیا تھا۔ انکو اچانک یہ گمان گذرا تھا کہ بس حکومت انہیں ملنے ہی والی ہے۔ کار پر جھنڈا لگے گا ایوانِ حکومت کے دروازے وا ہوں گے۔ اور لیلیٰ اقتدار ان کے ساتھ "ہنی مون" کے لئے تیار ہو گی۔ لیکن معاملات انکے قابو میں نہیں آئے، اسی زمانے میں اصغر خان قومی اتحاد میں رہتے ہوئے بڑی تکلیف محسوس کر رہے تھے۔ قومی اتحاد مولویوں کا جھمیلا بن گیا تھا جس میں مغرب کی جدیدیت پر یقین رکھنے والے تحریک کے ان رہنماؤں کی دال گلنا کچھ مشکل ہو رہی تھی۔ پھر مزاجاً بھی اصغر خان ساجھے کی اس ہانڈی کے چھوٹے حصے دار بننے کے لئے تیار نہیں تھے لہٰذا ایک طرف وہ خود بھی قومی اتحاد سے نکلنا چاہتے تھے دوسری طرف قومی اتحاد سے مایوس بعض عناصر بھی انہیں نئی سیاسی قوت کے طور پر آزمانا چاہتے تھے۔ یہ تجربہ کامیاب نہیں ہوا لہٰذا ان کی ڈوریاں واپس کھینچ لی گئیں، جسکے نتیجے میں انہوں نے بھی عبوری حکومت کے سلسلے میں تند و تیز لہجہ اختیار کیا۔ اس طرح وہ اس اکثریتی طبقے کی حمایت بھی حاصل کرنا چاہتے تھے جو غیر یقینی سیاسی اور اقتصادی صورتحال سے سخت بے چینیوں کا شکار ہے۔ فوری انتخابات کا مطالبہ، قومی حکومت میں شمولیت سے گریز انکی اسی سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ تھا۔ اصغر خان نے ماضی میں اپنی کئی ناکامیوں کے بعد ایک ہی سبق سیکھا ہے کہ وہ اب فوری فوائد حاصل کرنے کے بجائے دور رس منصوبہ بندی کے قائل ہو گئے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ اس وقت کسی غیر منتخب سیاسی یا شہری حکومت میں انکی شمولیت مستقبل میں انکی ایک اور سیاسی موت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

اسی لئے انہوں نے عبوری حکومت کے رہنماؤں سے "خوشگوار ملاقات" کے دوران بھی شہری حکومت میں شامل نہ ہونے کے فیصلے کو برقرار رکھا ہے۔

شاہ احمد نورانی اور انکی جماعت کی سیاست ایک عرصے سے اصغر خان کی سیاست سے نتھی

باقی صفحہ ۵۰ پر

پاکستان کے ممتاز صحافی ایچ کے برکی کے قلم سے

فری پریس اور اتحادیئے

اَب انسانی حقوق کا نام کیوں نہیں لیتے

آج سے سال ڈیڑھ سال پہلے انسانی حقوق کا بڑا چرچا تھا۔ اتحادیئے دن رات ان حقوق کا لاگ الاپتے تھے اور ہمارے فری پریس والے تو چیخ پکار میں اپنے آقاؤں سے کچھ آٹھ دس قدم آگے ہی رہا کرتے تھے انسانی حقوق کی پاسداری ہر آزاد اور زندہ انسان کا ایک بنیادی فرض ہے۔ ایک ایسا فرض جس کی تکمیل کے بغیر کوئی قوم مہذب ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی لیکن پچھلے سال کا وہ تمام مشورہ اتحادیوں کا تخریب کاری کے لئے صرف ایک سٹنٹ تھا اس لئے بلکہ ڈور تو باہر سے ہلائی جا رہی تھی۔ اور کھلم کھلا اب دیکھنا یہ ہے کہ انسانی حقوق کے لئے یہ احتجاج اگر واقعی اتنا سنجیدہ تھا۔ تو آخر کار اس کا کیا ہوا۔ اور اب وہ کہاں ہیں۔

جب سے مارشل لاء لگا ہے پچھلے سال تک انسانی حقوق کے ٹھیکیداروں نے ان حقوق کے بارے میں نہ تو ہماری کوئی رہنمائی کی اور نہ ہی ان کے فقدان پر شکایت کی اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ انہیں مارشل لاء کے کسی ضابطے کا ڈر تھا۔ اس خاموشی کی اصل وجہ یہ تھی کہ اتحادیوں اور "فری پریس" کے لئے شکایت کی وجہ ہی باقی نہیں رہی تھی۔ اگر انہیں کوئی شکایت ہوتی تو یہ لوگ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور ان کی حکومت کی تعریفوں کے پل اس طرح نہ باندھتے، جو پچھلے سال سے تقریباً ان کا روزانہ کا معمول ہے ان کے اس رویہ سے اگر یہ نتیجہ نکالا جائے کہ ان کی نظروں میں سال رواں میں انسانی حقوق نہیں روندے گئے تو یہ کچھ زیادہ غلط نہیں ہوگا۔

آیئے اب دیکھیں کہ انسانی حقوق کے اصل ٹھیکیداروں کا اپنا ریکارڈ کیا ہے انسانی حقوق کا بیڑا سب سے پہلے واشنگٹن کے جمی کارٹر نے اٹھایا تھا اور ہمارے اتحادیوں نے تو یہ راگ امریکہ کی شہ پر الاپنا شروع کیا۔

امریکی اخباروں اور جریدوں نے مارشل لاء کے پہلے چند مہینوں میں ضیاء انتظامیہ کی تعریفیں کرنے کے بعد پاکستان کے متعلق لکھنا قریباً چھوڑ ہی دیا ہے جہاں تک کارٹر انتظامیہ کا تعلق ہے وہ پاکستان میں انسانی حقوق سب ٹھیک ہے" کا ٹھپا لگا چکی ہے۔ امریکی دفتر خارجہ کی سالانہ رپورٹ میں جو گذشتہ فروری یا مارچ میں شائع ہوئی تھی، اس میں بتایا گیا تھا کہ پاکستان میں حالات بہتر ہو گئے ہیں۔

اس طرح امریکی حکومت اور ہمارے اتحادیوں کی پوزیشن کچھ ایک جیسی ہی رہی ہے اور یہ ہونا بھی چاہیئے تھا یہ دونوں گذشتہ سال بھٹو صاحب کی حکومت سے انسانی حقوق کے حوالے سے بہت ناراض تھے اور اب ایک سال سے مطمئن نظر آتے ہیں۔ اس کا ایک ہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اب ایک سال سے پاکستان میں ہم آپ سب انسانی حقوق کی نعمت سے مالا مال ہیں۔ اس کا جائزہ بڑی آسانی سے پچھلے سال کے ریکارڈ سے لیا جا سکتا ہے۔

انسان کا سب سے پہلا اور بنیادی حق یہ ہے کہ وہ مارشل لاء کے تحت اپنی زندگی خوش و خرم بسر کرے اور چونکہ انسان۔ خاص طور پر پاکستانی انسان خطا کا پتلا ہے اس لئے اشد ضروری ہے کہ اسے قید بامشقت اور خاص طور پر کوڑوں اور ہاتھ کاٹنے وغیرہ کی سہولتیں با آسانی میسر ہوں پھر قانونی کارروائی سمری ملٹری کورٹ سے بہتر اور کہاں ہو سکتی ہے یہ حقوق پاکستان کے مزدوروں پیپلز پارٹی کے کارکنوں، رہنماؤں، وکیلوں، طلباء اور اخبار نویسوں کو بڑی بہتات کے ساتھ فراہم کئے گئے ہیں خواتین کو بھی مردوں کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا گیا ہے اور انہیں بھی پہلی بار جیلوں کی فضا سے لطف اٹھانے کا موقع دیا گیا ہے پھر وہ اخبارات، جرائد اور صحافی، جو اپنے خیالات اور نظریات کو مفاد پرستی اور نئے سیاسی موسم پر مقدم رکھیں انہیں درست کرنا بھی انسانی حقوق کا ایک ضروری حصہ ہے۔

پاکستان کا ہر فرد ان انسانی حقوق سے پوری طرح آگاہ ہو چکا ہے چونکہ مونگ پھلی والے کارٹر صاحب نہ اتحاد کے کسی لیڈر اور نہ ہی ہمارے فری پریس والوں نے اس نئے دور پر کوئی گلا شکوہ کیا ہے۔ اس لئے اب مناسب ہو گا کہ ہم ان چیزوں کی نشاندہی کر دیں۔ جو ان سب لوگوں کی نظروں میں نئے انسانی حقوق کا حصہ نہیں ہیں سر فہرست ان میں جمہوریت ہے اور یہ انسانی حقوق کا حصہ کیونکر بنے۔ پھر اظہار خیال اور حکومت وقت کی تنقید کھلی سول عدالتوں میں مقدمے۔ سب انسانی حقوق کے اس چارٹر سے خارج ہیں جو جمی کارٹر نے دنیا کو بخشا ہے اور جسے ہمارے اتحادیوں، ان کے اخباروں اور ان کے وکیلوں نے اپنایا ہے۔

پچھلے ایک سال کا یہ ریکارڈ اس بیدردی کے ساتھ پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اس ظالمانہ سٹنٹ کو مکمل طور پر بے نقاب کیا جائے، جو پی این اے کے ایجی ٹیشن کے دوران کھیلا گیا تھا، جمی کارٹر کا امریکہ اور نہ ہی سرمایہ دار اور سامراجی ایجنٹ اصل انسانی حقوق کے بارے میں مخلص تھے کیونکہ پچھلے ایک سال میں وہ تمام انسانی حقوق جنہیں ساری مہذب دنیا سکہ بند قرار دیتی ہے پاکستان میں اس قدر پامال ہوئے ہیں کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

اصل بات یہ ہے کہ پچھلے سال کا پی این اے کا خونی ایجی ٹیشن جس کا ایک جزو انسانی حقوق کا فراڈ تھا صرف ایک سامراجی سازش تھی کارٹر انتظامیہ اور اس کے پاکستانی کارندے انسانی حقوق سمیت بہت سے نعرے

ایک حربے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں اس سازش پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس ڈھول کا پول جناب بھٹو نے ۲۸ اپریل کو بڑی تفصیل کے ساتھ پارلیمنٹ کے ایک اجلاس میں کھولا تھا - اس سازش کا مقصد صرف پاکستان میں انتشار پیدا کرنا تھا تاکہ وزیر اعظم اسے سامراج کے چنگل سے نکالنے میں کامیاب نہ ہوں اور پاکستان کو ان کی قائدانہ صلاحیتوں سے محروم کیا جا سکے یہی وجہ ہے کہ ایک سال سے نہ تو کارٹر انتظامیہ نے اور نہ ہی اتحادیوں کے کیمپ نے پاکستان میں انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔ بلکہ اتحادیوں اور ان کے پریس نے ہر زنجیر اور کوڑے کی ظالمانہ ضرب پر بغلیں بجائیں، مارشل لا انتظامیہ کو اور اکسانے کی کوشش کی

اس سامراجی سازش میں جو لوگ ملوث تھے وہ تو اس حد تک خاموش ہیں کہ اب اس کی تردید کی کوشش نہیں کرتے البتہ اب پیپلز پارٹی کے منکوحہ مولوی کوثر نیازی نے اپنے مخصوص انداز میں اسے ٹھکرانے کی کوشش کی ہے جناب عزیز احمد نے مولوی جی کا ایک ٹھوس جواب دیا جو حسب معمول فری پریس کے کسی اخبار نے شائع کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی اور خود مولوی نیازی تو کسی ٹھوس چیز پر یقین ہی نہیں رکھتے ان سے گلا کرنا بے معنی ہے وہ تو عادت سے مجبور ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ معمول کے برعکس اندر ہی اندر سے بھٹو صاحب اور پی پی کی جڑیں کھودنے کی بجائے اپنے اصل روپ میں سامنے آ گئے ہیں۔ پی پی اگر اتنی زخم خوردہ نہ ہوتی تو بندہ اس کی لیڈر شپ سے کہتا "ہور چوپو"

بہرحال مولوی نیازی نے آخر کار ایک لحاظ سے پی پی پر ایک احسان کیا ہے کہ وہ اب خود کو بے نقاب کر کے آئندہ کے لیے اس کے خلاف سازش کرنے کے قابل نہیں رہے جناب بھٹو جو کام کسی وجہ سے کرنے سے مجبور تھے - وہ مولوی صاحب نے خود کر دکھایا۔ جوڑ توڑ کے علاوہ وہ اب کسی کام کے نہیں رہے - اور وہ اپنی سیاسی موت آپ مر جائیں گے -

پی پی لیڈر شپ کو صرف ایک خیال رکھنا ہوگا۔ کہ اب کوئی کسی صورت میں مولوی نیازی اور ان کے حواریوں کو بیک (BACK) مارنے کی اجازت نہ دے۔

لاہور

ایم احمد کی رپورٹ

ملزموں کو کن بااثر لوگوں کی سرپرستی حاصل ہے؟

"بااثر" لوگ ہیں کسی نہ کسی طرح بچ کر نکل جائیں گے -

یہ وہ ہے وہ عمومی تاثر جو پورے پنجاب میں بلکہ ملک میں شبنم ڈکیتی کیس میں ملوث مجرموں کے بارے میں پایا جاتا ہے - یہ تاثر اس پبلسٹی کے باوجود ہے جو شبنم کی وجہ سے اس کیس کو ملی اور ملک کا بچہ بچہ کیس کی تفصیلات سے آگاہ ہو گیا - اور شاید اسی پبلسٹی کا نتیجہ ہے کہ ملزم پکڑے بھی گئے ورنہ خود بقول پولیس کے وہ تو ایک عرصے سے رنگ رلیاں منا رہے تھے یہ کیس کیا رخ اختیار کرے گا اس کا اندازہ اس امتیازی سلوک سے بھی ہوتا ہے کہ جو اثر اور حیثیت کے مطابق پکڑ دھکڑ کے دوران بھی ملزموں سے روا رکھا گیا۔

کچھ ملزموں کی تصویریں شائع ہوئیں۔ جب کہ کچھ کے سروں پر چادریں ڈال دی گئیں اور ایک ملزم کے بارے میں تو عرصے تک یہی سوچا جاتا رہا کہ عوام کو بتایا جائے یا نہیں - پھر بہت دن بعد ایک سرکاری ہینڈ آؤٹ آیا جس کے ذریعے لوگوں کو پتہ چلا کہ ملزموں کو پولیس کی ہی نہیں فوجی افسر کی بھی سرپرستی حاصل تھی - وہ فوجی افسر کون ہے کس رینک کا ہے اور کن کن وارداتوں میں سرپرستی کرتا رہا ہے اس کے بارے میں عوام ابھی تک لاعلم ہیں انصاف کا تقاضہ تو یہ ... تھا کہ اس کے ساتھ بھی عام ملزموں کا سا سلوک کیا جاتا تھا اس کا نام عہدہ اور تصویر بھی شائع کی جاتی - اس کے کارناموں سے بھی عوام کو آگاہ کیا جاتا ... اس برتاؤ سے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ طلبا کی تو جیسے کوئی عزت ہی نہیں ہوتی اور شاید اساتذہ کی بھی - کیونکہ اس واقعہ میں نام نہاد طلبہ کے ملوث ہونے کو پوری طالب علم برادری اور خاص طور پر اساتذہ کے لئے کلنک کا ٹیکہ قرار دیا - پنجاب پولیس کے سربراہ نے ان اساتذہ کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا - لیکن ان حقائق سے وہ چشم پوشی کر گئے کہ اس میں دو پولیس افسر اور ایک فوجی افسر بھی ملوث ہے تو ان کے ملوث ہونے کا ذمہ دار کون ہوگا؟

شبنم ڈکیتی کیس کے بارے میں ملزموں کے بااثر ہونے کی وجہ سے بچ نکلنے کی قیاس آرائی کے علاوہ قانونی اور سیاسی حلقوں کی طرف سے جو تبصرے کئے جا رہے ہیں وہ بھی قابل غور ہیں - مثلاً یہ کہ جتنا بھی مسروقہ سامان برآمد

شبنم ڈکیتی کیس کے ملزم

پی این اے کے سرگرم کارکن تھے

ہوا - وہ ملزموں کے قبضہ سے نہیں بلکہ مختلف جگہوں سے برآمد کیا گیا ہے قانونی حلقوں کے نزدیک یہ ایک اہم نکتہ ہے جو کیس کو کمزور کر دیتا ہے - کیس اسی صورت میں مضبوط ہو سکتا تھا - جب سامان ملزموں کے قبضے سے برآمد ہوتا -

سیاسی حلقوں کا کہنا ہے کہ مقدمے میں ملوث نام نہاد طالب علم وہ ہیں - جو پی این اے کی "تحریک کے دوران" صف اوّل میں تھے اور جنہوں نے اس دوران بھی نیکوں کو لوٹ کر اور اسی قسم کی اجتماعی وارداتوں میں خاصا مال کمایا اس کو مفتی محمود کے اس بیان سے بھی تقویت ملتی ہے جو انہوں نے حال ہی میں ہاتھ کاٹنے کی اسلامی سزاؤں کے بارے میں دیا - یعنی یہ کہ جب تک اسلامی معاشرہ صحیح معنوں میں قائم نہیں ہو جاتا اس قسم کی سزائیں جائز نہیں - مفتی محمود کے بیان میں پوشیدہ مصلحتوں کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ہاتھ کاٹنے کے بارے میں اسلامی سزا کا اعلان جولائی ۷۷ء میں ہی ہو گیا تھا - لیکن مفتی محمود خاموش رہے پھر کراچی میں بینک ڈکیتی کے مجرموں کو یہ سزا سنائی گئی لیکن مفتی صاحب پھر بھی خاموش رہے اور اب جب کہ شبنم ڈکیتی کیس کے ملزم گرفتار ہو گئے ہیں - اور ان پر اسلامی سزا کا نفاذ بھی ممکن ہو سکتا ہے، مفتی صاحب کو اچانک صحیح اسلامی معاشرے کا خیال آنے لگا ہے -

عوامی حلقوں کا کہنا ہے کہ ملزموں کے چینہ سرغنہ فاروق بندیال کے نوکر کو بھی ملزموں میں شامل کر لیا گیا ہے، شاید اس لیے کہ اس کا بوجھ نوکر کے کندھوں پر ڈالا جا سکے - ایک ملزم نادر مگلسی کو پہلے ہی رہا کیا جا چکا ہے - ملزمان کی طرف سے ہائیکورٹ میں ایک رٹ بھی دائر کی جا رہی ہے - جو غالباً اس ڈائری کی اشاعت تک دائر کی جا چکی ہو گی - یقیناً اس میں پولیس کے بارے میں کئی سنسنی خیز انکشافات بھی ہوں گے - شبنم ڈکیتی کیس کے علاوہ پنجاب کے عوام اس سے بھی زیادہ سنسنی خیز ایک اور ڈکیتی کیس کے ملزموں کی تقدیر کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہیں جس کے بارے میں پولیس نے پہلے تو یہ کہا تھا کہ یہ فرضی قصہ ہے، لیکن بعد میں تسلیم کیا اور ملزموں کو گرفتار بھی کیا - وہ سوہدرہ کا شرمناک ترین ڈکیتی کیس تھا جس میں ڈاکوؤں نے نہ صرف گھر لوٹا بلکہ خواتین کی عصمت بھی لوٹی تھی امید ہے کہ اس کیس کے ملزموں کے بارے میں فیصلہ شبنم ڈکیتی کیس سے پہلے ہو گا کیونکہ وہ اس واقعہ سے کئی ماہ قبل رونما ہوا تھا - یہ اور بات ہے کہ کیونکہ اس میں کوئی شبنم نہیں تھی اس لیے اسے دبانے کی پوری پوری کوشش کی گئی

پی آئی اے کے باکمال لوگ، لاجواب پرواز

پیاسی میں جماعتیوں اور غیر جماعتیوں کی کشمکش

باکمال لوگ لاجواب پرواز

۲۰، ۲۵ باکمال لوگ پی آئی اے کی انجینئرنگ میں داخل ہوتے ہیں، وہاں بیٹھے ہوئے ایک دبلے پتلے شخص کو گریبان سے پکڑ کر دروازے تک گھسیٹتے ہیں پھر اچانک سارے اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور اس وقت تک آہنی مکوں، لاتوں اور لاٹھیوں سے مارتے رہتے ہیں، جب تک اس کے چہرے اور جسم پر بے شمار نشان نہیں ابھر آتے۔ پھر اسے بے ہوش حالت میں چھوڑ کر کسی دوسری لاجواب پرواز پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

یہ باکمال لوگ پی آئی اے کی سوداکار یونین پیاسی کے صالحین تھے۔ اور یہ ۱۲ جون کا ان کا تیسرا آپریشن تھا۔ اس سے قبل وہ اس طرح اپنی ہی تنظیم کے مخالف گروہ کے دو مخالفین کو ادھ موا کر کے چھوڑ آئے تھے۔ مسلح پولیس کے دستے مسلسل تندہی سے گشت کر رہے تھے۔ انجینئرنگ کے دروازے کے سامنے پولیس ٹرک کھڑا تھا، جس کے اردگرد بیسیوں پولیس آفیسرز اور سپاہی گھوم رہے تھے لیکن صالحین کے آپریشن میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ تھی، وہ دندناتے ہوئے مختلف جگہوں پر غنڈہ گردی کا کھلا مظاہرہ کرتے رہے۔ ایک کے بعد دوسرے کو بے ہوش کرتے رہے اور پولیس خاموش تماشائی بنی رہی۔ شاید وہ اس لئے خاموش تھے کہ پی آئی اے کی تاریخ میں پہلی بار یہ کام ہو رہا تھا یعنی پہلے تو پیاسی کی غنڈہ گردی کا شکار ایوبیا کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ مگر اس بار پیاسی کا ایک ٹولہ جس کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا، پیاسی ہی کے غیر جماعتیوں کو مار رہا تھا یونین کے معاملات میں جماعت کی مداخلت کے خلاف تھا، سو جماعت کے اشارے پر سزا مل رہی تھی۔ کہ جماعت اپنے باغیوں کو سزا دینے کا حق رکھتی ہے۔

عوام ابھی ۱۰ اپریل ۱۹۷۶ء کے اس خونی واقعہ کو نہیں بھولے ہوں گے جس میں جماعت کے مسلح غنڈوں نے ایوبیا کے کارکنوں پر دستی بموں، رائفلوں اور پستولوں سے حملہ کر دیا تھا، جس کے نتیجے میں پچھلی حکومت نے ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے ۱۲ اپریل کو ہونے والا ریفرنڈم ملتوی کر دیا۔ پی آئی اے میں ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر پابندی لگا دی، گروپ ۵ کے لوگوں کو یونین سرگرمیوں میں حصہ لینے سے روک دیا گیا اور ۵۷ آفیسرز اور کارکن جن میں سے اکثر یونینوں کے عہدیدار تھے، ملازمتوں سے الگ کر دیا گیا اور اس کے لئے اسمبلی سے آئین میں تبدیلی کی اور اس طرح پورے ملک میں اپنے لئے تنہائی کا سامان مہیا کیا۔

چھ ماہ بعد ایک یونین کی اجازت ملی۔ جس میں تینوں یونینوں سے کارکنوں کو لیا گیا۔ اور اس طرح یوپیائی کے نام سے یونین بنی۔ یونین کی تشکیل غیر فطری تھی۔ چنانچہ حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ہی اسکی جڑیں ہل گئیں پیاسی اور ایئر وینیز رجسٹر ہو کر آگئیں۔

ریفرنڈم ہوا پیاسی جیت گئی۔ لیکن اب مسئلہ ایک اور پیدا ہو گیا۔ یعنی پیاسی میں جماعتی (جماعت اسلامی) اور غیر جماعتی عناصر کا۔ یونین کا صدر عصمت جاوید غیر جماعتی تھا۔ جبکہ نائب صدر اور جنرل سیکریٹری مسٹر برجیس اور مولانا رفیق جماعتی۔ یہاں نئے تضادات ابھرے۔ ان ہی دنوں یونین کے صدر کورس کرنے منیلا چلے گئے جب واپس آئے تو انکے خلاف فضا تیار ہو چکی تھی۔ ان سے استعفے کا مطالبہ کیا گیا۔ انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا پھر تکرار اور تکرار کے بعد دھمکیاں بالآخر اپنے کمرے میں بند کر کے مارنے کی کوشش کی گئی اور پھر دو واضح گروپ سامنے آگئے۔ تمام غیر جماعتیوں نے عصمت جاوید کا ساتھ دینا شروع کر دیا جس کو دیکھ کر جماعتی صالحین طیش میں آگئے۔ پہلے پہل نعرے بازی کی تحریک آئی اور پھر مار پیٹ تک بات آگئی۔ اسی دوران صالحین نے آئین میں تبدیلی کر کے کسی کو نکالنے کا حق جنرل باڈی سے چھین کر اراکین کی انتظامیہ کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ یہ غیر قانونی تبدیلی تھی، چنانچہ عہدیداروں

باقی صفحہ ۵۰ پر

ہزاروں حسرتیں ایسی ----

جو کچھ ہو رہا ہے، جو کچھ دل پر گذر رہی ہے، اسے رقم کرنا آسان نہیں ہے اور رقم کئے بغیر چارہ بھی نہیں ہے کہ یہ تاریخ اور وقت کا تقاضا ہے۔

کبھی کبھی سوچنے لگتا ہوں کہ وہ زمانہ کب آئے گا، جب ہمارے ہاں صرف وہی کچھ ہو گا، جو ہونا چاہئیے

دنیا میں ایسے ملک بھی ہیں، جہاں ہر شخص، ہر شعبہ، ہر ادارہ صرف اپنا کام ہی کرتا ہے، سیاستدان اپنا کام کرتے ہیں۔ عوام اپنا کام کرتے ہیں۔ فوج اپنا کام کرتی ہے۔

پاکستان میں وہ دن کب آئے گا جب کوئی شخص سیاسی انتقام کی بنیاد پر اپنی آزادی سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ اسے اپنی زندگی کے قیمتی لمحات جیل کی چار دیواری میں بسر نہیں کرنے پڑیں گے۔ ملک کو اس کی صلاحیتوں سے استفادے سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

پاکستان میں وہ دن کب آئیں گے جب جمہوریت اپنے صحیح معنوں میں زیرِ عمل آئے گی۔ عوام اپنے نمائندے منتخب کر کے کاروبارِ مملکت کا بوجھ ان پر چھوڑ دیں گے اسمبلیاں اپنے فرائض کسی رکاوٹ اور دباؤ کے بغیر انجام دیں گی۔ ملک کے مسائل، صوبے کے مسائل اسمبلیوں کے پلیٹ فارم پر اٹھائے جائیں گے۔ ان کا مستقل حل تلاش کیا جائے گا۔ پھر اس حل پر عملدرآمد بھی ہو گا۔ عوام کو اپنی پریشانیوں کے سلسلے میں دفتر، دفتر سڑک سڑک گھومنا نہیں پڑے گا۔

عوام کی اکثریت کی رائے سے منتخب ہونے والے حکمران صرف اور صرف ملک و قوم کی خاطر قدم اٹھائیں گے۔ لوگوں کے مسائل حل کریں گے کسی کے خلاف انتقامی کارروائی نہیں کریں گے۔ اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ اپنے اقرباء اور دوستوں کو سرکاری اختیارات سے فائدہ نہیں اٹھانے دیں گے۔ وہ اپنے ائیر کنڈیشنڈ دفاتر اور گھروں میں بیٹھ کر لوگوں کی مشکلات اور مصیبتوں کو بھول نہیں جائیں گے۔

پاکستان میں وہ دن کب آئے گا جب صرف اور صرف عوام کی رائے کو ہی مستند اور مؤثر کیا جائے گا۔ ان کی مرضی کے خلاف کوئی ادارہ، کوئی طاقت کچھ نہیں کر سکے گی، عوام جس طریقۂ حکومت کو پسند کریں گے، وہی طریقہ چلنے دیا جائے گا۔ اور وہ جس پارٹی کو اپنی پسندیدہ پارٹی سمجھیں، وہی عوام پر حکمرانی کی مستحق ہو گی۔

وہ زمانہ کب آئے گا جب ہماری مسلّح افواج سرحدوں کی حفاظت یا آفاتِ ناگہانی کے زمانے میں اندرونِ ملک خدمت کے علاوہ کسی دوسرے کام کو اپنے لئے ضروری نہیں سمجھیں گی، سیاسی معاملات میں دلچسپی لینے کے بارے میں سوچیں گی بھی نہیں۔ انہیں عوام کی اکثریت کی رائے کا احترام ہو گا، جب ان کا یہ ایمان ہو گا کہ عوام کی اکثریت اپنے لئے جو راستہ منتخب کرتی ہے، وہی قوم اور ملک کے لئے بہتری کا راستہ ہے۔ قوم اپنے پیٹ کاٹ کر، انہیں اپنے بجٹ کے ۶۰ سے زیادہ حصّہ کی مقدار اس لئے گردانتی ہے کہ وہ دشمنوں کا مقابلہ کریں۔ انہیں جدید ترین اسلحہ سے اس لئے لیس کرتی ہے کہ وہ وقت پڑنے پر پاکستان کی حفاظت کریں، جس طرح سارے مہذب ممالک سارے جمہوری ممالک میں ہوتا ہے ان کی یہ مسلّح قوت کسی صورت میں بھی عوام کی رائے کا بدل نہیں بن سکتی۔ طاقت کا سرچشمہ عوام ہی ہیں۔

پاکستان میں وہ زمانہ کب آئے گا جب کسی بھی سول حکومت کو یہ خطرہ نہیں ہو گا کہ سرکاری ملازم جو قوم کے خادم ہوتے ہیں۔ وہ ملک اور جمہوریت کے راستے میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔

پاکستان میں وہ زمانہ کب آئے گا، جب ہر شخص کو آزادی ہو گی کہ وہ جو بولنا چاہتا ہے، بولے، جو لکھنا چاہتا ہے، لکھے۔ جو محسوس کرنا چاہتا ہے۔ محسوس کرے جب تقریر پر پابندی ہو گی، نہ صحافت پر۔ اخبارات حکمرانوں سمیت سب پر تنقید کر سکیں گے۔ جو غلط قدم اٹھے گا، اس کی نشاندہی کر سکیں گے۔

پاکستان میں وہ زمانہ کب آئے گا جب ہر پاکستانی کو دوسرے سب پاکستانیوں کے برابر حقوق حاصل ہوں گے۔ کوئی اپنے سرکاری مرتبے، کوئی اپنے سیاسی اثر و رسوخ، کوئی اپنے مال و متاع، کوئی اپنی یونیفارم کے باعث دوسرے پر فوقیت نہیں رکھے گا۔

پاکستان میں وہ دن کب آئیں گے جب پاکستانی بچے، بچیاں۔ کسی خوف و ہراس کے بغیر پرورش پا سکیں گی۔ جب سب کچھ نارمل ہو گا۔ کوئی کسی کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔ راستہ نہیں روکے گا۔

ہم نے شاید یہ ملک حاصل تو اس لئے کیا تھا اور قائد اعظم رحؒ نے جمہوریت کو اپنی منزل شاید اس لئے قرار دیا تھا۔

مگر اب یہ سب باتیں حسرت بن کر رہ گئی ہیں

ہزاروں حسرتیں ایسی -------

عبدالوحید کٹپر

جی ہاں یہ باریش بزرگ عبدالوحید کٹپر ہی ہیں۔ سندھ کے سابق وزیر مواصلات، وزیر صحت، وزیر قانون اور ایک زمانے میں قائم مقام وزیر اعلےٰ بھی۔ کبھی ان کی طبیعت کی شوخی و رنگینی کے قصے بھی بہت عام تھے لیکن پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہونے کے بعد ایک عرصہ جیل میں گذرا تو مزاج کے ساتھ چہرے پر بھی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ سفید رنگ کی دراز داڑھی والے ان عبدالوحید کٹپر کے بارے میں ماضی کی یہ باتیں اب محض افسانہ معلوم ہوتی ہیں۔

وہ طویل عرصے بعد جیل سے رہا ہوئے تو اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے شہنائیوں کی آواز میں رخصت کیا اور ساتھ ہی پارٹی اور حکومت میں اپنے دوستوں اور سیاسی مخالفوں کی میزبانی کا شرف بھی حاصل کیا۔ آج کل وہ جیل کی کلفتوں کو بھلاتے اور ماضی کی یادوں میں کھوئے ہوئے خاموش سی زندگی گذار رہے ہیں۔

میر علی احمد تالپور

گرجدار آواز میں تقاریر کرنے اور موقف پر ڈٹے رہنے کی سیاست کرنے والے میر علی احمد خان تالپور جو اپنی زندگی کے باسٹھ سال گزار چکے ہیں۔ ایک بار پھر تازہ تازہ دولہا بنے ہیں۔ میر صاحب اقتدار کے دولہا تو صرف ایک بار بن سکے ہیں لیکن دولہن کے دولہا تیسری بار بنے ہیں۔ سندھ کی سیاست میں میروں کو ایک خاص مقام اور حیثیت حاصل ہے۔ اور میروں میں میر علی احمد تالپور کو۔ شادی سے چند روز قبل مکان کی مرمت اور رنگ و روغن میں مصروف شہد ملی جیسمن چائے بار بار پینے کے راز کی اصل وجہ کو اب ہر کوئی جان گیا ہے کہ نواسے اور پوتے والے میر صاحب نے شادی کی مبارکباد دینے والے ایک صاحب سے خوب کہا "سرکار میں تنہا ہوگیا تھا۔ اس تنہائی کو دور کرنے کا آسان ترین نسخہ صرف شادی کرنا تھا اور ویسے بھی تو اسلام میں چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے۔ میں نے تو صرف تین کی ہیں۔

جاوید اقبال کا صفحہ

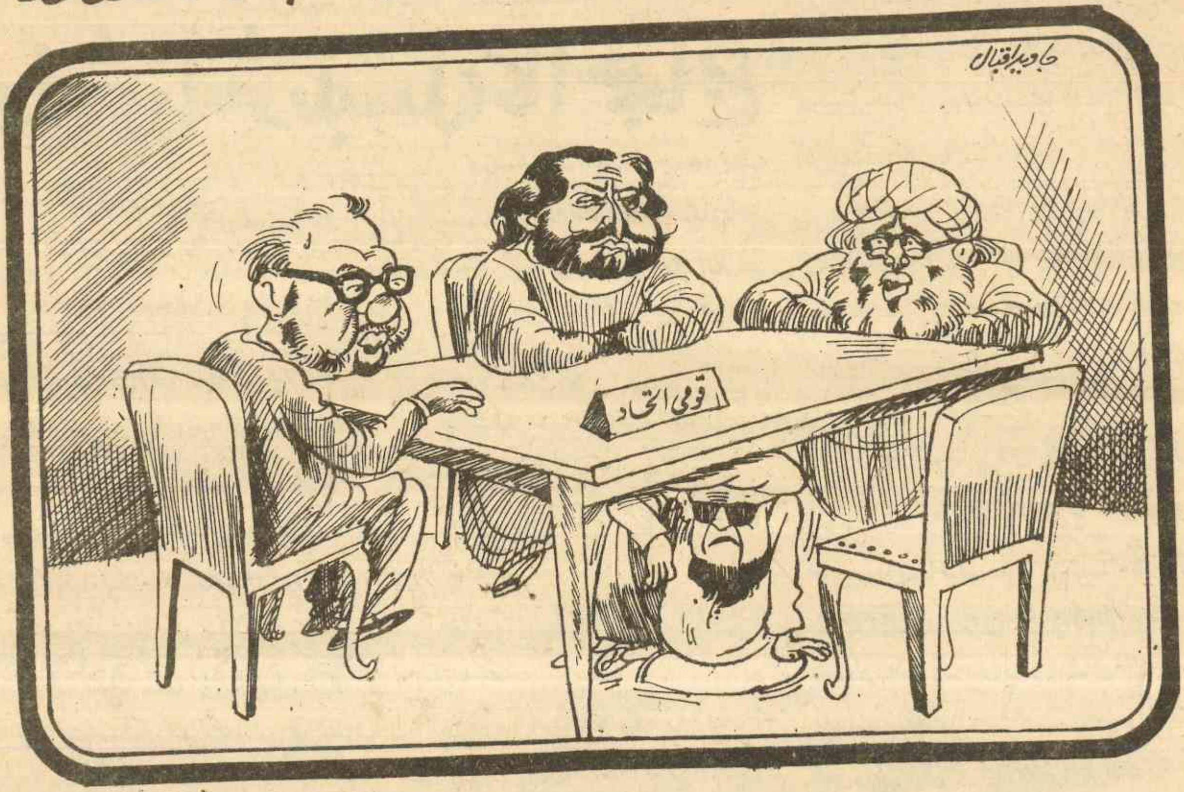

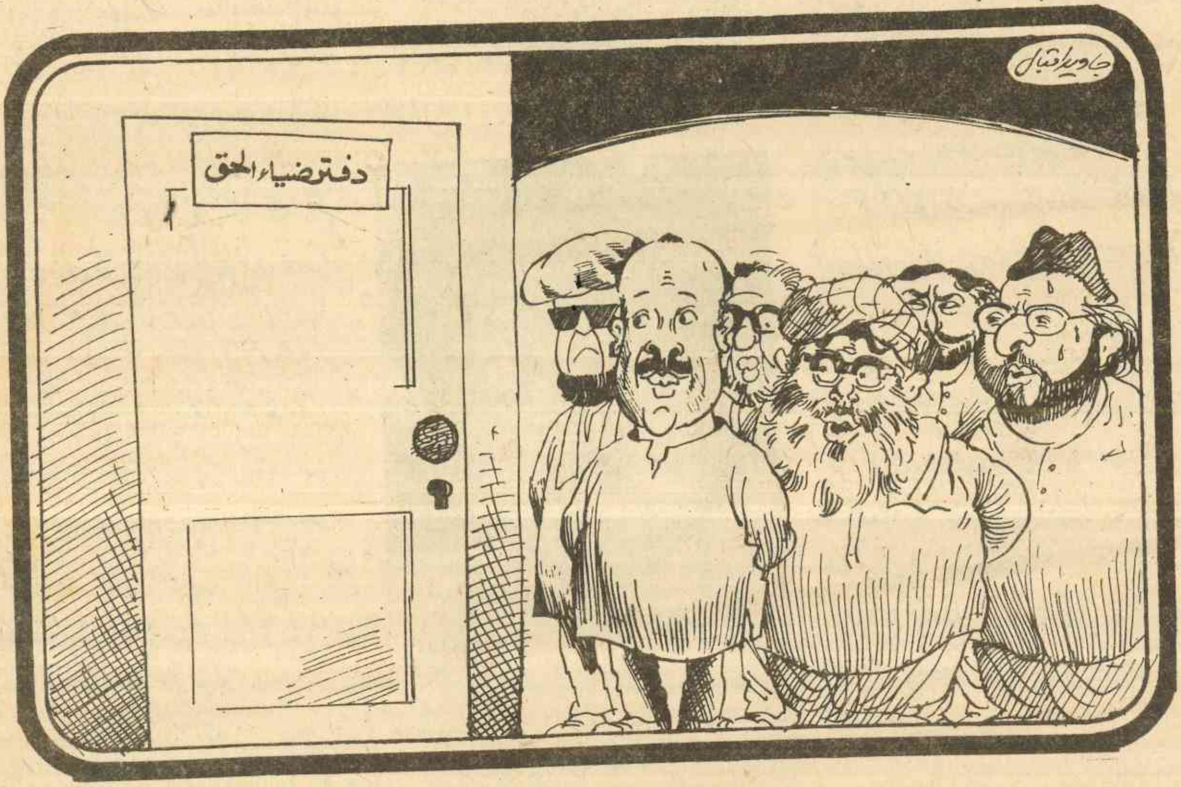

صحافیوں کو کوڑے لگانے پر

ایمنسٹی انٹرنیشنل کا احتجاج

کہکشاں رپورٹ

ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ۲۰ تا ۲۵ جنوری کے پاکستان مشن کی رپورٹ ۵ ارمئی کو جاری کی گئی۔ اس میں پاکستان میں مارشل لاء کی سخت دفعات کے نفاذ پر، جن کے ذریعہ بنیادی آزادی میں کمی اور امتناعی نظر بندی کا اختیار حاصل ہوتا ہے، سخت تشویش کا اظہار کیا گیا۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے خاص طور پر اس طریق کار پر تشویش کا اظہار کیا کہ شہریوں کی سیاسی تعزیر کے لئے فوجی عدالتوں میں مقدمات چلائے جاتے ہیں۔ جو اکثر حالتوں میں کوڑے لگانے کی سزائیں دیتی ہیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کوڑے لگانے کو ایک "ظالمانہ" غیر انسانی اور توہین آمیز سزا سمجھتی ہے جیسا کہ بین الاقوامی قانون میں بتایا گیا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اب تک کم از کم ۱۶۰ سیاسی قیدیوں کو کوڑے لگانے کی سزا دی جا چکی ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل اس بات پر پریشان ہے کہ یہ غیر معمولی سزا پاکستان میں دی جا رہی ہے اور ان قیدیوں کو دی جا رہی ہے جن کے متعلق اکثر حالات میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قصور اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ انہوں نے آزادیٔ تقریر و اظہار رائے کے حق کو استعمال کیا جس کی دستور میں ضمانت دی گئی ہے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل کی انٹرنیشنل ایگزیکٹو کمیٹی کے چیئرمین طامس ہمبرگ نے رپورٹ کے پیش لفظ میں اس بات پر نکتہ چینی کی ہے کہ پاکستان میں سزائے موت دی جاتی ہے۔ انہوں نے ان سزاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو حال ہی میں شہریوں کو فوجی عدالتوں کے فیصلے کے تحت منظر عام پر دی گئیں یہ کہا ہے کہ ان کے ذریعہ ایک خطرناک مثال قائم ہوتی ہے۔

انہوں نے حکومت پاکستان سے انسانی بنیاد پر ایمنسٹی انٹرنیشنل کی طرف سے کی جانے والی اس اپیل کا اعادہ کیا ہے کہ سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے چار شریک ملزموں کو قتل کا مجرم قرار دیتے ہوئے جو سزائے موت سنائی گئی ہے اس میں تخفیف کی جائے (اپریل نیوز لیٹر)

● رپورٹ کی متعدد سفارشات میں ایمنسٹی انٹرنیشنل نے حکومت پاکستان سے استدعا کی ہے کہ:

شہریوں پر فوجی عدالتوں میں مقدمہ چلانے کا طریقہ ختم کیا جائے۔

سیاسی قیدیوں کو کوڑے کی سزا کا فی الفور خاتمہ کیا جائے۔

وہ موجودہ قانونی دفعات ختم کی جائیں جن کے تحت سیاسی قیدیوں کی امتناعی نظر بندی کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

خصوصی عدالتیں ختم کی جائیں، خاص طور پر وہ عدالتیں جن میں سیاسی قیدیوں کے مقدمات کی سماعت ہو رہی ہے۔

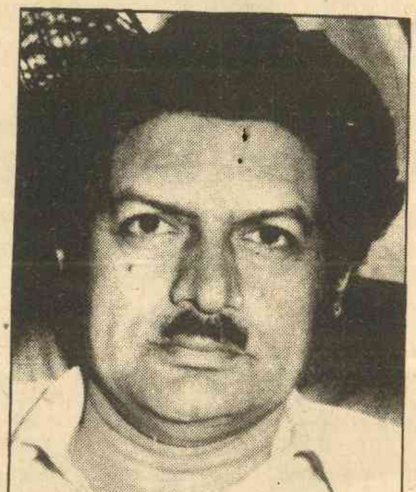

مسعود اللہ خان

مسٹر بھٹو کے خلاف مقدمات کی کارروائیوں کے تمام مراحل میں جن میں اپیل کا مرحلہ بھی شامل ہو، بین الاقوامی مبصرین کو داخل کیا جائے۔ بین الاقوامی تنظیموں کو سابق وزیر اعظم سے قید میں ملنے کی اجازت دی جائے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے لیڈروں کے خلاف امتناعی نظر بندی کے احکام واپس لئے جائیں۔

مذکورہ بالا سفارشات ایمنسٹی انٹرنیشنل نے جنوری میں اپنے دورۂ پاکستان کے نتیجے میں پیش کی ہیں جس میں اسے وسیع پیمانے پر تعاون حاصل ہوا تھا۔ یہ وفد پروفیسر ممتاز سوا نزال ساتس چیئرمین انٹرنیشنل ایگزیکٹو کمیٹی، ایمنسٹی انٹرنیشنل اور روالی دو دنے ٹریلجن رکن انٹرنیشنل سکریٹریٹ، ایمنسٹی انٹرنیشنل پر مشتمل تھا۔ اس وفد نے جنرل محمد ضیاء الحق نیز ممتاز سرکاری عہدیداروں، وکیلوں اور سیاسی قیدیوں کے رشتے داروں سے ملاقاتیں کیں۔ اس وفد نے لاہور کی ان فوجی عدالتوں کا معائنہ کیا جہاں شہریوں پر مقدمات چل رہے تھے۔ لیکن اسے قید خانے میں مسٹر بھٹو سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس مشن کے دورۂ پاکستان کے زمانے تک سیاسی قیدیوں کی تعداد کا جو تخمینہ بتایا گیا ہے وہ کئی سو ہے۔ سابق وزیر اعظم کے کئی ہزار حامیوں کو اب تک مارشل لاء کی دفعات کے تحت گرفتار کیا جا چکا ہے۔ جن میں سے بہتوں نے مسٹر بھٹو کو دی جانے والی سزائے موت کے خلاف احتجاج کیا تھا۔

یکم مئی کو لاہور میں ۲۶ صحافیوں کو مارشل لاء کے تحت گرفتار کیا گیا۔ انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت کرنے والے اخبار روزنامہ "مساوات" کے بند ہو جانے کے خلاف احتجاجاً بھوک ہڑتال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح ۱۵ رمئی کو جب کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ ریلیز کی گئی تھی، ۱۷ صحافیوں کو مارشل لاء کے تحت گرفتار کیا گیا جن میں سے ۳۰ سے زائد کو قید خانے میں کوڑے لگائے گئے۔ ان میں پاکستان ٹائمز کے ایک سینئر سب ایڈیٹر مسعود اللہ خان بھی تھے جن کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ ایک ٹانگ سے معذور ہیں۔

اہلِ قلم نے جیلوں میں کیا دیکھا

ایپنک اور پی ایف یو جے کی قیادت میں آزادیٔ صحافت کے لئے جدوجہد میں قید بامشقت اور کوڑوں کی سزائیں جھیلنے والے صحافی اور اخباری کارکن جیلوں سے باہر آگئے ہیں اک نئے حوصلے اور تازہ عزم کے ساتھ۔ ایک نئی جدوجہد کے لئے پھر سے کمربستہ - ان اخباری کارکنوں نے پنجاب کی مختلف جیلوں میں اپنی قید کے دوران جو تجربات اور مشاہدات حاصل کئے ہیں وہ دلچسپ بھی ہیں اور عبرتناک بھی۔ جس طرح اخلاقی و سیاسی قیدیوں کے ساتھ ان جیلوں میں غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا ہے اس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری یہ جیلیں مجرموں کی اصلاح کرنے کے بجائے انہیں عادی اور پیشہ ور مجرم بنانے میں کیا کردار ادا کرتی ہیں -

صحافی اگرچہ خود بھی سزا یافتہ قیدی تھے، لیکن ان کا پیشہ ورانہ احساس جاگ رہا تھا۔ یہ تحریریں اسی احساس کا اظہار ہیں - !!

ہم ہر دور کے مجرم ہیں

نوجوان صحافی ظفر قریشی پنجاب کی جیلوں کی روداد سناتے ہیں

کہتے ہیں کہ کسی ملک کے سرکاری ملازمین کی کارکردگی اگر دیکھنا ہو تو وہاں یہ دیکھنا چاہیئے کہ ٹرینیں اپنے نظام اوقات کے مطابق چل رہی ہیں یا نہیں اور کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کسی ملک میں یہ دیکھنا ہے کہ وہاں کے عوام کے ساتھ کس حد تک انصاف ہو رہا ہے تو وہاں کی جیلیں دیکھئے۔

۱۵ مئی کو میں کراچی سے روانہ ہوا اور اگلے دن صرف ساڑھے تین گھنٹے کی تاخیر سے لاہور پہنچا۔ ۱۷ مئی کو آزادیٔ صحافت اور مساوات کی بحالی کی تاریخی تحریک میں شامل ہو کر ہزاروں کے نعرے لگاتے ہوئے ہجوم سے گرفتاری پیش کی، بعد میں مجھ پر جو الزامات لگائے گئے ان کے ذریعے مجھے علم ہوا کہ میں ضابطہ نمبر پانچ اور تینتیس کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا تھا۔ یہ کیا چیز ہے اور شہریوں سے اس کا کیا تعلق ہے، اس پر میں بات نہیں کرونگا کیونکہ شاید اسکی وضاحت بھی کسی ضابطے کی خلاف ورزی ثابت ہو جائے۔ بہرحال ایک حوالات

اور چار جیلوں یعنی مجموعی طور پر ساڑھے چار جیلوں کی یاترا کے بعد جو اعداد و شمار میں نے جمع کئے وہ کچھ یہ تھے۔ سیاسی قیدی پچاس فیصد، وردی پوش بھگوڑے ۲۵ فی صد اور اخلاقی مجرم ۲۵ فیصد، پھر جیلوں کا عالم یہ تھا کہ اگر گنجائش چھ سو دس کی ہے تو گیارہ سو کچھ قیدی رکھے گئے ہیں۔ آٹھ سو قیدیوں کی گنجائش کی جیل میں سترہ سو اور ایک ہزار دس کی گنجائش کی جیل میں پندرہ سو کے لگ بھگ قیدی تھے -

۱۷ مئی کی رات سول لائینز تھانے کی حوالات میں گذارنے کے بعد اگلے دن ہمیں کیمپ جیل منتقل کیا گیا۔ ڈیوڑھی میں موجود جیل کے ہنس مکھ اور خوش مزاج عملے نے مسکراہٹوں کے پھول نچھاور کرتے ہوئے ہمارا خیر مقدم کیا اور بے ضرر قسم کی اونچی آواز میں دو دو کی قطار میں بیٹھ جانے کی ہدایت کر کے اپنی روایتی خوش اخلاقی

کا ثبوت پیش کیا۔

کیمپ جیل میں قیام تک ہماری حیثیت ملزمان کی تھی۔ وہاں سب سے پہلے ڈیوڑھی میں ہمارا اندراج ہوا پھر ہمیں چکر میں لے جایا گیا، جہاں ہمارے نام اور دیگر کوائف درج کئے گئے اور قیام کے لئے چکی نمبر ۱۰ کی دو کوٹھریاں ہمارے حوالے کی گئیں، جہاں لاہور کے کمسن مقتول پپو کے قاتلوں کو رکھا گیا تھا۔ چکی نمبر دس کو جو کیمپ جیل میں "منڈا چکی" کہلاتی ہے اور جہاں کمسن ملزم رکھے جاتے ہیں ہمارے لئے خالی کرائی گئی تھی۔ یہاں پیپلز پارٹی کے متعدد لیڈر اور بم کیس اور چوہاری کیس میں ملوث آٹھ دس نوجوان ملزم رکھے گئے تھے۔ "کھلا کھاؤ تے ننگے نہاؤ" اس چکی کا نعرہ تھا چنانچہ چکی میں داخل ہوتے ہی ہم نے کپڑے اتار پھینکے اور نہا دھو کر کھانے کے لئے بیٹھ گئے جس کا انتظام وہاں پہلے سے موجود ہمارے ساتھیوں نے کر رکھا تھا کھانے کے بعد پڑوسیوں سے ملاقات کی گئی بم کیس میں ملوث کئے جانے والے کھاتے پیتے خوشحال گھرانوں کے ان نوجوانوں نے اس تشدد کے بارے میں تفصیلاً بتایا جو اس کیس کی تحقیقات کے مرحلے میں ان پر کیا گیا پھر ان میں سے ایک نے ہنستے ہوئے کہا کہ اتنے تشدد کے بعد تو ہم کینیڈی کو قتل کرنے کا اعتراف کر لیتے۔ مگر اس کیس کے دلچسپ پہلو یہ ہیں کہ جو شخص سابق حکمران جماعت کے کسی مشہور لیکن حکومت وقت کے مخالف رہنما کا ساتھی یا معتمد ہو، وہ بھی شامل تفتیش کیا جا سکتا ہے اور دوران تفتیش اس کے پیشاب سے خون بھی نکالا اور اس کی ایک آدھ ہڈی توڑی جا سکتی ہے۔ اگر وہ بات سمجھ گیا تو ٹھیک ورنہ اسے جیل میں سڑایا بھی جا سکتا ہے

کسی عام ایرانی ہوٹل کی طرح کیمپ جیل میں جگہ جگہ نعرے درج ہیں جنہیں دیکھ کر ہم ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے، مثلاً ایک نعرہ تھا "تم میں اچھا آدمی وہ ہے جو حاکم وقت کی اطاعت کرتا ہے" ایک اور نعرہ تھا "عاجزی اور انکساری بہت سی برائیوں کو فنا کر دیتی ہے"۔

کیمپ جیل میں قیام مختصر رہا لیکن یہاں مختلف النوع پابندیوں کے باوجود ہم نے اسے خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔ تاہم چونکہ ہماری چکی نمبر دس میں فلش سسٹم نہیں تھا، اس لئے بحالت مجبوری کھڈیاں استعمال کرنی پڑی تھیں جو ایک قطار کی شکل میں ہیں۔ بیت الخلاء کی صفائی پر مامور عملہ صبح پانچ بجے جونہی اپنا کام مکمل کر کے جاتا تھا اور ہماری کوٹھریاں کھولی جاتی تھیں، ہم حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کے لئے دوڑ پڑتے تھے کیونکہ تاخیر کا مطلب یہ ہوتا کہ کھڈیوں میں ایک بار پھر غلاظت اور مکھیاں جمع ہو جائیں جس کے نتیجے میں وہاں بیٹھنا دشوار ہو جاتا۔

کیمپ جیل ہمارے لئے ایک ٹرانزٹ جیل کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہیں سے ہمیں سمری سماعت کی عدالت میں لے جایا جاتا جہاں ایک ہی الزام کے تحت گرفتار کئے جانے والے اخباری کارکنوں کو ان کی معیاد اور جرمانوں کی سزائیں سنائی جاتیں ایک ہی نوعیت کے گواہوں اور کارروائیوں کے باوجود بعض گروپوں کے فیصلے میں کئی کئی گھنٹوں کی تاخیر ہوتی اور بعض کے فیصلے چٹ پٹ ہو جاتے: تاخیر کی صورت میں ہم ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالے، جوڑوں کی شکل میں عدالت کے لان میں یا حوالات میں بیٹھے ہوتے۔ پولیس والے اگر مہربان ہوتے تو پانی اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں ہم تک پہنچ جاتیں اور بصورت دیگر بھوکا پیاسا واپس جیل پہنچایا جاتا۔ جس دن ہمارا فیصلہ ہوا، ہمیں ساڑھے سات گھنٹے تک شدید گرمی اور حبس میں پولیس کی بند گاڑی میں بٹھائے رکھا گیا کیونکہ سمری سماعت کرنے والے چاہتے تھے کہ ایکشن کمیٹی کے اراکین ہمراز احسن، علی اختر مرزا، آئی ایچ راشد، اعجاز رضوی اور ریاض ملک وغیرہ کا بھی فیصلہ کر دیں واضح رہے کہ وہ اس سے قبل ایک ماہ کے لئے نظر بند کئے گئے تھے اور نظر بندی کی صورت میں چونکہ انہیں ملازمت سے علیحدہ کرنا دشوار تھا، اس لئے بہتر یہ سمجھا گیا کہ پہلے انہیں سزا سنا دی جائے اور اس کے بعد انہیں ملازمت سے علیحدہ کر دیا جائے ان تمام حضرات کو ایک ایک سال قید بامشقت اور دس دس ہزار روپے جرمانے کی سزائیں سنانے کے بعد ہمارے ساتھ کوٹ لکھپت پہنچایا گیا جہاں ہم سے پہلے ہمارے پندرہ سولہ ساتھی موجود تھے۔ ہم رات تقریباً ساڑھے دس گیارہ بجے کوٹ لکھپت پہنچائے گئے۔ عموماً جیل کے حکام شام پانچ بجے کے بعد سزا یافتہ مجرموں کو قبول نہیں کرتے لیکن سرسری سماعت کے نتیجے میں جو لوگ مجرم قرار دیئے جاتے ہیں، انہیں جیل وجت کے بعد قبول کر ہی لیا جاتا ہے

کوٹ لکھپت

کوٹ لکھپت میں پہلی مرتبہ ہمیں "ملاحظے" کے مرحلے سے گزرنا پڑا۔ باقاعدہ قیدیوں کی وردی اور بستر ملے۔ وردی پہن کر اور بستر بغل میں دبا کر ڈیوڑھی کے سامنے پہنچے، جہاں سائے میں پہلے ہی چھڑکاؤ کیا جا چکا تھا۔ ہمیں حکم ملا کہ اپنی اپنی چپلیں اور جوتے اتار دیں بستر بچھائیں اور اس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جائیں اور سر جھکا لیں۔ ہم نے حسب حکم سر جھکا لیے۔ اس عرصے میں ہمارے سامنے "صاحب بہادر" یعنی سپرنٹنڈنٹ صاحب کی میز لگائی گئی۔ اس پر میز پوش بچھایا گیا چار پانچ رجسٹر روشنائی کی بوتل اور قلم وغیرہ رکھے گئے۔ ملاحظے کا قاعدہ یہ ہوتا ہے۔ کہ جب صاحب بہادر آتے ہیں۔ تو ان کے ساتھ نمبرداروں کی ایک فوج ہوتی ہے۔ صاحب بہادر، کرسی پر بیٹھنے سے قبل نئے مجرموں کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں اور اس کے بعد باری باری ہر مجرم کو طلب کیا جاتا مجرم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ سیدھا کھڑا ہوگا اور صاحب بہادر کے سوالوں کے جواب ادب سے اور با آواز بلند دے گا۔ اگر اس نے ہاتھ اٹھانے یا پشت پر لے جانے یا کھجانے کی کوشش کی تو دائیں بائیں جانب کھڑے ہوئے نمبردار پیچھے ایک لات مارنے سے بھی

اچھا شوکر والا ○ ۳۸ بار جیل آچکا ہے

قیدیوں کی درد بھری کہانیاں ہمیں رلا دیتی تھیں

گریز نہیں کریں گے۔ ہمارے ایک ساتھی نے سنٹرل جیل لائلپور میں اسی قسم کی کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن دائیں جانب کھڑے ہوئے نمبردار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس زور سے جھٹکا تھا۔ کہ وہ دو دن تک درد سے کراہتا رہا تھا۔

کوٹ لکھپت ایسی مکمل تیاریوں کے باوجود صاحب بہادر ہمارے ملاحظے کے لیے تشریف نہ لائے جسکے سبب ہم سمجھ گئے کہ ہمیں یہاں سے بھی منتقل کیا جائے گا کوٹ لکھپت کے اسپتال میں ہماری ملاقات سابق حکومت کے ایک سینٹر سے ہوئی۔ تعارف ہونے پر ہم نے کہا۔ جناب ہم تو ہیں ہر دور کے مجرم۔ اس پر وہ کافی جھینپے اور کہنے لگے۔ کہ بھائی ہم سے ایک بڑی غلطی یہی ہوئی کہ اخبارات کے سلسلے میں سخت رویہ اختیار کیا۔

کوٹ لکھپت میں بھٹو صاحب کے بارے میں کافی کہانیاں گشت کرتی ہیں جب ہم پہنچے ہیں تو اس وقت تک وہ پنڈی منتقل کئے جا چکے تھے اور یہ محض اتفاق تھا کہ انہیں سزائے موت پانے والے مجرموں کی جس بارک میں رکھا گیا تھا، ہماری بارک اس کے پڑوس میں تھی اور بیچ میں صرف ایک دیوار حائل تھی۔ ان کی کوٹھری چونکہ بارک نمبر سات سے جس میں ہم تھے، نظر آتی تھی، اس لئے مختلف نمبرداروں سے کچھ باتیں دریافت کیں۔ ایک نمبردار نے بتایا کہ جب تک بھٹو صاحب یہاں تھے، جیل میں سخت پابندیاں تھیں۔ ان کی کوٹھری کی چھت پر غیر معمولی حفاظتی انتظامات تھے اور قیدیوں اور نمبرداروں کو اس طرف سے گذرنے کی اجازت نہیں تھی تقریباً کرفیو کا سا سماں تھا۔ ایک اور نمبردار نے کہا کہ بھٹو صاحب کو اب بھی اپنے کارکنوں کا اتنا خیال ہے کہ ایک مرتبہ بے نظیر بھٹو جب ان سے ملنے آئیں تو انہوں نے ان سے کہا کہ یہاں پارٹی کے کافی کارکن موجود ہیں اگر جیل حکام اجازت دیں تو ان میں سے ایک آدھ کارکن سے ضرور ملتی جانا۔ نمبردار نے یہ نہیں بتایا کہ یہ روایت اس تک کیسے پہنچی، لیکن وہ اس روایت سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا اور اس یقین کا اظہار بھی کر رہا تھا کہ بے نظیر بھٹو نے باپ کی ہدایت پر کسی نہ کسی کارکن سے ضرور ملاقات کی ہوگی۔

کوٹ لکھپت میں پہلے دن علی الصبح اٹھے تو بھٹو صاحب کی کوٹھری کے ارد گرد، دو بگلے نما پرندے جنہیں پنجاب میں "گل ٹمو" کہا جاتا ہے، منڈلاتے نظر آئے، وہ اس قدر شور مچا رہے تھے کہ اس سلسلے میں معلومات کے لئے پھر نمبردار سے رجوع کرنا پڑا معلوم یہ ہوا کہ بھٹو صاحب اپنے ناشتے اور شام کے کھانے میں بچی کھچی کچھ چیزیں ان بگلوں کو روزانہ ڈالا کرتے تھے جس کے نتیجے میں بگلے ان سے بہت مانوس ہو گئے تھے نمبردار نے یہ بھی بتایا کہ چونکہ کھانے کی ان چیزوں میں جیل کے کوّے بھی حصہ دار ہوتے تھے، اس لئے

دو بگلے

بھٹو صاحب سے ملنے

کوٹ لکھپت آتے تھے

وہ بھی بڑی تعداد میں جمع ہو جاتے تھے اور طرح دونوں بگلوں اور درجنوں کوّوں کے درمیان روزانہ صبح و شام جنگ و جدال جاری رہتی۔

ہم کوٹ لکھپت میں تین دن رہے اور ان تین دنوں کے دوران روز صبح و شام ہم نے بگلوں کے چیخنے چلانے اور کوٹھری کے گرد منڈلانے اور کوّوں سے ان کی لڑائی کا منظر بلا ناغہ دیکھا۔ بلکہ بعد میں کوٹ لکھپت کی اس بارک میں ہمارے جو ساتھی گئے تھے ان سے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ بگلے بدستور آتے رہے تھے۔

ڈسٹرکٹ جیل فیصل آباد

کوٹ لکھپت میں تیسرے دن ہم بھنے ہوئے چنے اور گڑ کا ناشتہ کر کے اپنی مشقت شروع کرنے کے ارادے سے اٹھے تھے کہ نمبردار نے آ کر بتایا کہ ہماری منتقلی کے احکام آ گئے ہیں اور سوائے پاکستان ٹائمز کے عزیز صدیقی صاحب کے سب کو پنجاب کی دوسری جیلوں میں منتقل کر دیا جائے گا۔ ہمارے لئے قیام و طعام کا بندوبست ڈسٹرکٹ جیل فیصل آباد میں کیا گیا تھا یعنی چار گھنٹے کے بعد پولیس کی بند گاڑی میں اونگھتے جھٹکتے ڈسٹرکٹ جیل فیصل آباد پہنچے تو حکام نے ہماری ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اُن کا موقف یہ تھا کہ جیل میں چونکہ چھ سو افراد کی گنجائش ہے اور ۱۳ خواتین سمیت بارہ سو کے لگ بھگ افراد موجود ہیں اس لئے ان نئے دس قیدیوں کو قبول نہیں کیا جا سکتا ڈسٹرکٹ جیل کے احکام کے ہی کہنے پر ہمیں سنٹرل جیل فیصل آباد بھیجا گیا لیکن یہاں بھی صورت حال ایسی ہی تھی پھر اس جیل کے صاحب بہادر کے ایک نائب اس بات پر بھی چراغ پا تھے کہ ڈسٹرکٹ جیل جیسی چھوٹی اور کچی جیل کے احکام نے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات پنجاب کے احکام کی خلاف ورزی کی جرأت کیسے کی۔ چنانچہ ایک بار پھر ہمیں ڈسٹرکٹ جیل لے جایا گیا اس طرح تقریباً آٹھ گھنٹے تک ادھر سے ادھر لے جانے کے بعد ڈسٹرکٹ جیل کے حکام نے ہمیں قبول کر لیا اور ہمارے لئے ایک چکی خالی کرائی گئی جس کی دو کوٹھریوں میں پنکھے موجود تھے۔

مٹی کی بنی ہوئی اس جیل کی یوں تو کئی خصوصیات ہیں

لیکن سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں خارشی بہت جلد لگتی ہے یہاں ہماری حیثیت نظر بند قیدیوں کی تھی اور شاید اسی لئے دن میں دو مرتبہ کوٹھڑیوں میں بند کیا جاتا تھا۔ ڈسٹرکٹ جیل میں گھوڑی کی پیچش جیسی دال کھانے سے بار بار انکار کرنے پر ہمارا نمبردار بہت پریشان ہوا۔ پھر اس نے اسپیشل دال کا اہتمام کیا جس میں تڑاخی کے طور پر کچا تیل ڈالا گیا تھا اور دال کو مزیدار بنانے کے لئے سرخ مرچیں پیس کر اوپر سے چھڑک دی گئی تھیں یہ صورت حال بھی ہمارے لئے ناقابل قبول تھی اور ابھی ہم شش و پنج میں تھے کہ ایک مزدور لیڈر چراغ دین اور ایم پی اے بدرالدین کا پیغام ملا کہ آپ لوگ جب تک یہاں ہیں آپ کے ناشتے اور کھانے کا انتظام ہم کریں گے چنانچہ یہ معاملہ اس طرح حل ہوا۔ اخبارات ڈیڑھ دن پرانے ملتے تھے اس لئے بڑی الجھن ہوتی تھی لیکن ۔ افٹ بائی فٹ کی دو کوٹھڑیوں میں محبوس ہم دس آدمی کر بھی کیا سکتے تھے فیصل آباد کے اخباری نمائندوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی چھوٹے شہروں کے عام نامہ نگاروں کی طرح غالباً ڈسٹرکٹ کمشنر سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ ہم سے ملنے نہیں آئے یہاں ہم نے لگ بھگ چار دن گذارے جو چار ماہ کے برابر تھے کیونکہ کام بھی کوئی نہیں تھا گرمی بھی شدید تھی اور پابندیاں بھی زیادہ

سنٹرل جیل فیصل آباد

ہمارا طویل ترین قیام سنٹرل جیل فیصل آباد میں ہوا۔ ڈسٹرکٹ جیل میں قیام کے چوتھے دن ہمیں سنٹرل جیل پہنچایا گیا۔ جہاں پہلے سے چھ ساتھی مساوات کے جناب طاہر اسدی کی قیادت میں ہمارے منتظر تھے پہلے دن جس اسپیشل بارک میں ہمیں رکھا گیا، وہاں شیخ مجیب الرحمان، عطاء اللہ مینگل اور خان عبدالولی خان کو بھی رکھا گیا تھا۔ ہم نے بڑے اشتیاق سے شیخ مجیب کی کوٹھڑی دیکھی احاطے میں ان کا لگایا ہوا درخت اب بڑا ہو چکا ہے اور اب قیدی اس سے ٹیک کر ورزش کرتے ہیں۔ عطاء اللہ مینگل کا لگایا ہوا درخت بھی ہم نے دیکھا جو ابھی کم سن ہے شیخ مجیب کی کوٹھڑی ہی میں ڈسٹرکٹ جیل والوں کو ٹھہرانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ لیکن

گنجائش سے زیادہ بھری ہوئی جیلیں ہمیں قبول کرنے کو تیار نہیں تھیں

طاہر اسدی صاحب نے کہا کہ ہم کسی بھی صورت میں اپنے ساتھیوں کو سزائے موت پانے والے قیدیوں کی کوٹھڑی میں رکھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس پر ہمارے سونے کا انتظام اسی بارک میں کر دیا گیا جو ان کوٹھڑیوں کے قریب بنائی گئی ہے اور جس میں ولی خان اور عطاء اللہ مینگل کو رکھا گیا تھا یہاں ہمارے ساتھی پنڈی پیپلز پارٹی کے پانچ چھ لیڈر بھی تھے۔ جن میں پنڈی ہی کے ایک ریٹائرڈ کرنل شامل ہیں پہلی رات طاہر اسدی صاحب اور ہمارے ایک ساتھی تخت پاشا نے رات دو بجے تک شاہ حسین کی کافیاں اور لوک گیت سنائے اگلے دن۔ صبح میں ہم ریٹائرڈ کرنل صاحب سے حالات حاضرہ پر گفتگو کر ہی رہے تھے کہ ہمیں دوسری بارک میں منتقل کرنے کا حکم آگیا یہ بارک سی کلاس کی تھی لیکن یہاں بھی واجبی ہی سہی لیکن پنکھوں کا انتظام تھا اس وقت تک سرکار کی طرف سے ہمیں بی کلاس دینے کا اعلان ہو چکا تھا۔ اس لئے اسی سی کلاس کو 'بی' قرار دیا گیا اور چارپائیاں فراہم کر دی گئیں۔ یہاں بھی ہمارے پڑوسی پیپلز پارٹی کے متعدد لیڈر تھے ان کی نظربندی کا یہ عالم تھا کہ ضابطہ نمبر ۹ کے تحت تین ماہ کے لئے نظر بند کئے گئے تھے لیکن ابھی یہ میعاد ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ضابطہ نمبر ۱۳ کے تحت ان کی نظربندی میں توسیع ہو گئی۔ یہاں رکھے جانے والے سات آٹھ افراد بار بار کہتے کہ پہلے تو آپ ایک دلائی کیمپ کو روتے تھے یہ کیا ہے؟ نہ مقدمہ نہ پیشی اور نہ کوئی کارروائی۔ آپ ہی یہ بتائیں کہ یہاں جیل سے بیٹھ کر ہم نے کیا شر پسندی کی ہے کہ نظربندی میں اضافہ ضروری اور ناگزیر ہو گیا؟ انہی نظر بندوں میں چھیلی خان نامی ایک نظر بند تھا جسے نہ تو اردو آتی تھی اور نہ پنجابی ایک ٹانگ سے معذور اس شخص کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے بقول اس کے فیصل آباد کے ایک بااثر چودھری کو اپنی زمین کم قیمت پر بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔ چودھری کا غصہ اسے نظر بند کرانے کے بعد بھی ختم نہیں ہوا اس نے اسے چودہ سال کی سزائے قید دلانے کی غرض سے اس پہ اسلحہ کا ایک کیس بھی بنانے کی کوشش کی تھی لیکن جیل کے ذرائع کے مطابق یہ کیس چل نہیں سکا۔ کیونکہ اسلحہ کی فروخت کی تاریخیں وہ بتائی گئی تھیں۔ جن میں وہ جیل میں نظر بند تھا۔

اس بارک میں آمد کے پانچ چھ دن کے بعد قلعہ گوجر سنگھ لاہور کے پہلوان اچھا شکروالا کو بھی وہاں منتقل کیا گیا تھا فلم ملنگی، فیم اچھا شکر والا۔ پنج وقتہ نمازی آدمی ہے یاروں کا یار، اور غریبوں، بے کسوں اور کمزوروں کا ہمدرد ہے خود اس کا کہنا ہے کہ میں قیام پاکستان کے بعد ۳۸ مرتبہ جیل آچکا ہوں لیکن کبھی بھی غنڈہ گردی کا الزام کوئی مجھ پر ثابت نہیں کر سکا۔ ہاں میں اس کا اعتراف ضرور کرتا ہوں کہ پولیس اور سرکاری اہل کار اگر لوگوں کو پریشان کریں تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ بھائی آخر کیا بات ہے؟ بس اس پر مجھے بدمعاش کا خطاب دے دیا گیا بقول ان کے ہر دور میں وہ شر پسندی کے الزام میں بند رہے ہیں اور اب تک یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ شر پسندی ہوتی کیا چیز ہے؟

اچھے پہلوان نے ان چودہ کہانیوں میں سے ایک کہانی کا ایک منظر بھی سنایا جو فی الحال ان کے سینے میں دفن ہے اور جسے وہ وقت ملنے پر فلمانے کا ارادہ رکھتے ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ اگر ان کی حسب منشا فلم بن گئی تو نوکر شاہی بے نقاب ہو جائے گی۔ ادن کے گھگھلے بنانے کی مشقت اپنی جگہ، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اچھے پہلوان کی آمد کے بعد اور قیمتی یوسف نامی ایک لیکچرر کی موجودگی کی وجہ سے ہمارا وقت بہت اچھا کٹا۔ ہماری آمد کے بعد قیمتی صاحب اور ان کے بھائی سردار نے ہمارے اعزاز میں ایک ظہرانے کا اہتمام کیا۔ پلاؤ۔ قورمہ، چٹنی اور کسٹرڈ پڈنگ کھانے کے بعد جب کچی لسی پی کر اٹھے تو اس خیال سے ہی کہ کتنے عرصے کے بعد ڈھنگ کا کھانا ملا ہے ہمیں نشہ چڑھنے لگا اور ہم دیر تک اونگھتے رہے۔

قیمتی صاحب اور ان کے بھائی کو عمر قید کی سزا ملی ہے لیکن ابھی سپریم کورٹ میں ان کی اپیل زیر سماعت

باقی صفحہ ۵۰ پر

ناصر زیدی

کوکوڑے لگنے کی آوازیں میرا حوصلہ بڑھا رہی تھیں

کوڑے کھانے کے بعد سٹریچر پر جانے کی پیش کش کو میں نے ٹھکرا دیا

کوڑے کھانیوالے صحافی خاور نعیم ہاشمی بتاتے ہیں

۷ مئی کو ہم گرفتار ہوئے تھے اور اس سے اگلے روز پولیس نے ہمارا ۱۹ مئی تک ریمانڈ حاصل کر لیا جس کے بعد ہمیں کیمپ جیل پہنچا دیا گیا، جہاں چکی نمبر دس میں ہم سے پہلے آنے والے ساتھی سلیم عاصمی، عزیز صدیقی ہمارے منتظر تھے۔ ان کے علاوہ بم کیس میں ملوث کئے جانے والے خالد چودھری۔ اعجاز زاہد اور ان کے ساتھ ملک عارف اعوان سینیٹر اسلم اور دیگر پیپلز پارٹی کے سابق ارکان اسمبلی بھی موجود تھے ٹھنڈا شربت پلا کر ساتھیوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔

۱۹ مئی تک ہمارا جوڈیشنل ریمانڈ تھا مگر اگلے ہی روز یعنی ۱۰ مئی کو ہمیں اچانک فوجی عدالت میں لے جایا گیا۔ کئی گھنٹے فوجی عدالت کے باہر کڑی دھوپ میں بٹھانے کے بعد بتایا گیا کہ اگلے روز پیشی ہے چنانچہ ۱۱ مئی کو ہم پھر فوجی عدالت کے سامنے پیش ہوئے چار نئے ساتھیوں سے بھی یہاں ملاقات ہوئی جن میں جنگ کے عبدالحمید چھاپرا، خواجہ نثار پاکستان ٹائمز کے مسعود اللہ خان اور مساوات کے سید محمد صوفی شامل تھے۔ سید محمد صوفی اور مسعود اللہ خان کے ہاتھ رسیوں سے باندھے گئے تھے پولیس کا کہنا تھا کہ ہتھکڑیاں کم پڑ گئی ہیں۔

فوجی عدالت کی روایتی کارروائی کا آغاز ہوا پولیس افسران نے حلف اٹھا کر ہمارے خلاف گواہی دی فوجی عدالت کے سربراہ میجر نے ہم سے پوچھا کہ آپ ان الزامات کے جواب میں کیا کہنا چاہتے ہیں ہم نے کہا کہ حلف اٹھا کر جھوٹی شہادتیں دینے والوں کے خلاف ہم کیا کہیں اگر آپ ہماری طرف سے کچھ صفائی چاہتے ہیں تو اپنے سرکاری گواہوں سے کہیں کہ وہ کلام پاک اٹھا کر ہم پر یہ تمام الزامات لگائیں۔ اس مسئلے پر کچھ دیر ہمارا مباحثہ ہوا جس کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ عدالتی کارروائی کا بائیکاٹ کیا جائے۔ کچھ دیر بعد ہی ہمیں کمرہ عدالت سے باہر بھیج دیا گیا یہ کوئی ساڑھے چار بجے کا وقت تھا کہیں ساڑھے سات بجے ہمیں فوجی عدالت میں لایا گیا اور ایک ایک کر کے سزائیں سنائی جانے لگیں۔ سب میں پہلے مسعود اللہ خان کو نو ماہ قید بامشقت اور جرمانے کے علاوہ پانچ کوڑوں کی سزا بھی سنائی گئی۔ اس کے بعد ہمارے گروپ کو طلب کیا گیا اور فتح بھائی میمن کے علاوہ مجھے

ڈاکٹر نے میرے کان میں کہا تم بھی اَن فٹ ہو مگر مجبوری ہے

ناصر زیدی اور اقبال جعفری کو قید با مشقت کے ساتھ کوڑوں کی سزا سنائی گئی یہ ہمارے لیے کوئی اتنی زیادہ غیر متوقع بات نہیں تھی مگر ہمیں یہ امید نہیں تھی کہ دو ہی گھنٹے بعد "ٹکٹکی" پر بندھے ہوں گے کیونکہ ہم نے سنا تھا کہ عادی مجرموں کو بھی سزا سنانے کے ایک ہفتے بعد تک کہیں جا کر کوڑے لگتے ہیں۔

فوجی عدالت سے سزا سن کر رات تقریباً آٹھ بجے ہم گیارہ ساتھیوں کو پولیس نے ہتھکڑیاں کھول کر ٹرک میں سوار کرایا اور اب ہماری منزل کوٹ لکھپت جیل تھی۔

گیٹ کے اندر ہمیں جیل حکام کے علاوہ فوجی افسران بھی نظر آئے جیل سپرنٹنڈنٹ نے مسعود اللہ خان۔ اقبال جعفری۔ ناصر زیدی اور مجھے باقی ساتھیوں سے الگ کر کے ایک دوسرے کمرے میں بھیج دیا یہاں ہمارا "ملاحظہ" ہوا چند منٹوں کے بعد ہمیں اس کمرے سے باہر لایا گیا تو اس وقت تک ہمارے باقی سات ساتھی احاطہ سے "ملاحظہ" کرا کے جا چکے تھے یہاں سے ہمیں جیل کے "مین پھاٹک" کے اندر داخل کیا گیا تو ہم نے دیکھا کہ "ٹکٹکی" ہماری منتظر ہے اور دو جانگیہ پہنے ہوئے پہلوان ہاتھوں میں کوڑے تھامے با ادب کھڑے ہیں چند گز کے فاصلے پر کرسیوں اور بینچوں پر جیل کے حکام اور فوجی افسران براجمان تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں ازمنہ وسطیٰ کے دور کے کسی دربار میں کھڑا ہوں۔ جیل کے محافظوں نے ہمارے ہاتھ پکڑے اور ڈاکٹر صاحب نے انتہائی تپاک اور گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا اور کہا کہ "میں آپ حضرات ہی کا منتظر تھا۔"

ڈاکٹر صاحب ہم چاروں کو اس احاطے سے ملحق اپنے کمرے میں لے گئے۔ ہمارے دلوں کی دھڑکنیں اور بلڈ پریشر چیک کیا۔ مسعود اللہ خان نہ صرف ایک ٹانگ سے معذور ہیں، بلکہ ٹریفک کے ایک حادثے سے ان کے دوسرے جسمانی اعضاء بھی متاثر ہیں۔ ناصر زیدی ایک انتہائی متعدی مرض میں مبتلا ہے اس روز صبح ہی سے اقبال جعفری کو ایک سو دو بخار تھا اور اس وقت بھی وہ بخار سے پھنک رہا تھا۔ اور میرے بارے میں بھی ڈاکٹر صاحب نے آہستگی سے کہہ دیا تھا کہ "تم بھی ان فٹ ہو مگر مجبوری ہے۔"

سب سے پہلے ناصر زیدی کو لے جایا گیا اس دن لاہور میں شدید گرمی پڑ رہی تھی مگر اچانک تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے جس کی وجہ سے ناصر زیدی کو ٹکٹکی سے اتار لیا گیا، پندرہ منٹ بعد ناصر زیدی کو پھر لے جایا گیا۔ ایک، دو، تین، چار اور پانچویں کوڑے لگنے کی یہ آوازیں مجھے حوصلہ دے رہی تھیں ناصر زیدی اس وقت مجھے اپنے دل کی دھڑکنوں میں سمایا ہوا لگتا تھا ناصر زیدی کو پانچواں کوڑا لگتے ہی اقبال جعفری کمرے سے باہر نکلا اور پھر میں نے اقبال جعفری کو کوڑے لگنے کی آوازیں سنیں۔

پانچویں کوڑے کی پھنکار ختم ہوئی تو میں روانہ ہوا۔ "ٹکٹکی" پر مجھے باندھ دیا گیا ہاتھ اوپر اٹھا کر میرا منہ دائیں جانب کر دیا گیا اور پھر میری پیٹھ پر جیسے ہی پہلا کوڑا پڑا میرا منہ بائیں جانب ہو گیا جہاں کرسیوں پر "اعلیٰ حکام" تھے اور پھر ان کے کہنے کے باوجود پانچویں کوڑے تک میری آنکھیں کوڑے مارنے کا حکم دینے والوں کو دیکھتی رہیں، ایسا لگتا تھا نفرت میری آنکھوں میں منجمد ہو گئی ہے۔

"ٹکٹکی" سے مجھے کھول کر جب اسٹریچر پر انہوں نے مجھے لے جانے کو کہا تو میں نے ان کی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور اپنی کانپتی ٹانگوں سے ہسپتال گیا، میرے جذبے کی وقت مجھے سہارا دے رہی تھی ہسپتال میں کوئی پرسان حال نہ تھا۔ دوسرے دن بھی کوئی ڈاکٹر نہیں آیا۔ اور پھر اسی دن ہمیں اپنے ساتھیوں کے ساتھ منتقل کر دیا گیا۔

۱۶ مئی کو ہمیں حکم ملا کہ یہاں سے دوسری جیلوں میں منتقل ہونے کے لئے تیار ہو جائیں میرے حصہ میں ساہیوال جیل آئی۔ ساہیوال جیل پنجاب کی چند ایک مشہور و معروف جیلوں میں سے ہے جہاں خطرناک اور عادی مجرموں کو رکھا جاتا ہے۔

میانوالی جیل میرے

۱۳

پی ایف یو جے کے نائب صدر اور پاکستان ٹائمز کے اسلم شیخ بتاتے ہیں

بھاولپور جیل میں ایام اسیری کی داستان علی احمد خان سناتے ہیں

پاکستانی صحافیوں کی حمایت میں ہندوستانی صحافیوں کا جلوس

سب اچھا ہے' کا مطلب پھانسی ہوگئی

چھ

چھ ماہ قید بامشقت اور تین ہزار روپے جرمانے کی سزا سنا کر ہمیں ۱۰ مئی کو کیمپ جیل سے کوٹ لکھپت جیل میں منتقل کر دیا گیا تھا سینیٹر احسان الحق۔ جی ایم بدر الدین صاحب نثار عثمانی صاحب پہلے سے یہاں موجود تھے جنہوں نے بڑی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا جیل کی ابتدائی کاروائی

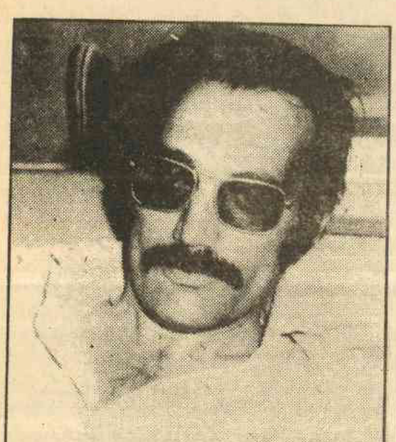

...کسی بھی قسم کی سہولت ...ید گرمی میں پانی بھی مشکل

...ہر جانب ہم نے یہ ...س لئے دی گئی تھی کہ ...اں دیں اور افواج پاکستان ...بنیاد بات ہے جس کا ...ں ہے۔ کوڑے کھانے ... اپنے ساتھیوں کے پاس ...بتایا کہ سزا سنانے سے ...تیں اور جیل کے ایک ...ہا تھا کہ "تم میں سے ...ب مسئلہ طے ہو جائے گا۔"

...ے ایک نیا دریافت شدہ جزیرہ تھی

...ی کو اچانک نثار عثمانی نے ...طلاع دی کہ ہمیں مختلف شہروں ...ں چند گھنٹے بعد ہی ہے۔ ...ہ تقریباً تمام ہی ساتھی آگئے ...وں میں گزرتا تھا۔ دوستوں ...تھا مگر نئے سفر کے بارے

...ں ڈال کر مجھ سمیت ۱۲ ساتھیوں ...شام لے جایا گیا دو سو اور دو سو ...ت گرمی اور پھر اونچے نیچے ...کوئی پولیس وین سے ہم میانوالی

...ے میں بڑا اسٹیشن رکھا تھا۔ یہ ...ا ہے جہاں گاندھی سے لے کر ...وزیر اعظم بھٹو تک اپنی نظر بندی ...جیل ایک سو پانچ سال پرانی ...ائش بھی مفقود ہے۔ جو انگریزوں

کے دور میں بنائے جانے والے جیل مینول کے تحت ایک قیدی کو ملنی چاہیے۔ جیل کا عملہ قیدیوں سے حیوانوں کی طرح سلوک کرتا ہے مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ جیسے میں قرون وسطیٰ یا رومن امپائر کی سوسائٹی میں واپس آگیا ہوں

ہمیں ایک ایسے کمرے میں نظر بند کیا گیا تھا جسے "کمرہ محض" کہا جاتا ہے۔ یہاں سی کلاس کی تمام تکلیفیں فراہم کی گئی تھیں پیشہ ور عادی مجرموں کے ساتھ ہم سب سے مشقت لی جاتی تھی۔ ہمارے پانچ ساتھیوں کو ایک فیکٹری میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ مساوات لاہور کے شبیر انگلن اور ملت کراچی کے حفیظ سے "مونج کوٹنے" کی مشقت لی جاتی تھی۔

اس جیل میں ایک بڑی تعداد ہندوستانی جاسوسوں اور اسمگلروں کی تھی اور دوسرے پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی مگر سلوک سب کے ساتھ یکساں ہوتا تھا۔ جیل مینول کے تحت ہر قیدی کو ہفتہ میں ایک بار ملاقات کی اجازت ہوتی ہے مگر اس جیل کا ایک اذیت ناک پہلو یہ بھی تھا۔ کہ نہ صرف یہ کہ دوستوں سے بلکہ عزیزوں سے بھی ملاقات کی اجازت نہیں تھی پھر یہ جیل ایک ایسے دور افتادہ مقام پر ہے جہاں معمولی قسم کی سہولت بھی حاصل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔

میانوالی جیل کی ان تمام تر تکالیف اور مصائب کے باوجود ہم جتنے بھی اخباری کارکن نظر بند تھے۔ ان کے حوصلے اور عزائم بہت بلند تھے۔ اور ہم نے کسی بھی مرحلے پر جیل حکام سے کسی ایسی سہولت کے لیے درخواست نہیں کی جو دوسرے قیدیوں کو حاصل نہیں تھی حالانکہ ہمارے معاشرے کی طرح اس جیل میں بھی چوری اور ناجائز طریقے سے ہر چیز حاصل کی جاسکتی تھی۔ میرے لیے یہ چیز بھی بڑی دلچسپ تھی کہ جیل کے اندر ایک پوری مارکیٹ موجود تھی جہاں ہر قسم کی چیز دو اور تین گناہ دام میں مل جاتی تھی مگر اس سے غریب اور شریف قسم کے قیدی محروم رہا کرتے تھے" میرے لئے میانوالی جیل ایک ایسا جزیرہ ثابت ہوا ہے جسے میں نے ۲۷ مئی کو دریافت کیا گو کہ قید کی مدت ہماری توقع سے کم رہی جس کے سبب مشاہدے اور تجربے کی تمام منزلیں طے نہ کر سکے مگر یہ مختصر تجربہ بھی میری زندگی کے لیے یادگار رہا جو شاید میں کوٹ لکھپت یا کسی دوسری جیل میں حاصل نہ کر پاتا۔

جیل میں پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی اکثریت تھی

سے فراغت کے بعد سب میں پہلے مجھے اس بات کا خیال آیا کہ اس جیل میں پاکستان کا سابق وزیر اعظم بھی نظر بند ہے۔ اور جس کے بارے میں آج بھی ہر خبر ملکی و غیر ملکی اخبارات اور ریڈیو سے بڑے اہتمام سے سنائی جاتی ہے۔ اپنے تجسس کا اظہار جب میں نے ایک پرانے قیدی سے کیا تو اس نے سرگوشی میں مجھ سے کہا "بھٹو صاحب کے بارے سوچنے سے بھی قید کی میعاد میں اضافہ ہو جاتا ہے"۔

۳۔ مئی کو ہمیں عثمانی صاحب آ کر اطلاع دی کہ سات سات کی ٹکڑیوں میں ہمیں مختلف جیلوں میں منتقل کیا جانے والا ہے۔ اور پھر شام ۵ بجے ایک بند گاڑی مجھ سمیت ۲۰ قیدیوں اور آٹھ پولیس والوں کو لے کر چل پڑی۔

بند گاڑی میں گنجائش سے زیادہ افراد اس پر سے شدید گرمی اور کچے راستوں کا اذیت ناک سفر طے کرتے ہوئے صبح آٹھ بجے بہاولپور جیل پہنچے اس دوران۔ ساہیوال اور ملتان جیل کے حصّے کے قیدی اتارے جا چکے تھے۔

جیل کی روایتی کارروائی سے فراغت کے بعد ہمیں ۲۰ نمبر چکی میں پہنچا دیا گیا جہاں پہلے سے پیپلز پارٹی کے ۱۴ کارکن موجود تھے۔ دوسرے دن "ملاحظہ" ہوا اور قیدیوں والے کپڑے ملے۔ بیچ میدان میں ہی ہیڈ وارڈر نے حکم دیا کہ "جیل کی وردی" پہن لو۔ ہم نے سمجھا کہ یہ کپڑے ہم اپنے وارڈ میں پہن لیں گے مگر اس نے ہمیں جیل کے قانون کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ کپڑے تو یہیں تبدیل کرنے پڑیں گے۔ لاچار ادھر اُدھر سے آنکھیں چراتے ہوئے۔ ہم نے کپڑے تبدیل کرنا شروع کر دیئے۔ ہم سب میں زیادہ شرمندہ شرمندہ شفقت تنویر مرزا تھے۔ مگر انہیں بھی بیچ میدان میں یہ قانونی فریضہ انجام دینا پڑا جیل میں جا کر یہ پہلی بار احساس ہوا کہ اصل مشقت "ذلت" برداشت کرنا ہے۔ تیسرے دن ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب کے سامنے ملاحظہ ہوا۔

"ملاحظہ" جیل کی ایک اصطلاح ہے۔ اس میں نئے قیدی کو دو محافظ سپرنٹنڈنٹ جیل کے سامنے پیش کرتے ہیں گردن جھکا کر دونوں ہاتھ باندھ کر بالکل سیدھے کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ نام اور باپ کے نام کے بعد پوچھا جاتا ہے کہ "کتھے بیٹھے" یعنی کہاں سے گرفتار ہوئے۔ ہمارے ایک ساتھی حکیم انترت سے جب پوچھا گیا کہ "کتھے بیٹھے" تو انہوں نے نہایت معصومیت سے کہا کہ جیل میں بیٹھے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ نے مجھے "ملاحظہ" کے بعد کرسیاں بننے کی مشقت دی مگر معلوم ہوا کہ کرسیاں نہیں ہیں۔ اس لیے اون کو سلجھانے کا کام دیا گیا جیل میں ہمیں صرف ایک بات کا انتظار رہتا تھا کہ آج "چار" کی گرفتاری ہوئی یا نہیں اور جس لمحے ہمیں یہ خبر ملتی ہم خوشی سے نعرے لگاتے اور ایک نئے عزم کے ساتھ اپنی قید کو بھول جاتے

جیل ہی کی نہیں میری زندگی کا بھی سب سے تلخ تجربہ وہ تھا جب ہمارے برابر میں پھانسی کے وارڈ میں ایک شخص کو پھانسی دی گئی۔ وہ شاید ۱۶ مئی کی تاریخ تھی

وُہ آگے بڑھ گئے، جنہیں کوڑوں کا اعزاز نصیب ہُوا

خلاف معمول علی الصبح سے برابر کے وارڈ میں سرگرمیوں" کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ٹھیک ۴ بجے پہلے کچھ آوازیں سنائیں دیں۔ اور پھر "یا علی" کے نعرے کے ساتھ ایک کھڑاک کی آواز آئی اور پھر طویل خاموشی .... تھوڑی دیر بعد جب وارڈر آیا تو ہم نے پوچھا کیا ہوا۔ اس نے کہا "سب اچھا ہے"۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سب اچھا کا مطلب یہ ہے۔ کہ پھانسی ہو گئی

جیل میں اکثریت یا تو پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی تھی یا فوجی بھگوڑوں کی ہماری بیرک میں تین مشقتی تھے۔ اور تینوں فوجی بھگوڑے تھے جیل میں ہم نے سنا کہ پچھلے چند ماہ سے فوجی بھگوڑں کی تعداد میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔

جیل میں ہمیں اس بات کا بھی تجربہ ہوا کہ وہاں ہر کام ہوتا ہے مگر چوری سے سیگریٹ بھی ملتی ہے۔ اور چرس بھی، بلیڈ بھی ملتا ہے۔ اور ماچس بھی گو کہ یہ چیزیں جیل مینول کے حساب سے کسی قیدی کو نہیں ملتیں مگر یہ ہر ایک کے پاس ہوتی ہیں اور طریقہ کار وہی چوری کا ہے۔ جب سپرنٹنڈنٹ صاحب آتے ہیں۔ تو دور سے آواز لگتی ہے۔ کہ "دورہ آگیا" "دورہ آگیا" یعنی اس کا مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ چوری کی تمام چیزیں چھپا دی جائیں۔ اور کمبل یا چٹائی پر بیٹھ کر جیلر صاحب کا استقبال کیا جائے

جیل میں سب سے مزے میں عادی اور خطرناک مجرم ہوتے ہیں۔ جیل کی ہر سطح کے حکام ان سے ڈرتے ہیں۔ ایک صاحب تھے جو بھنگ بیچنے کے الزام میں چوتھی بار گرفتار ہوئے تھے اس سے پہلے وہ تین بار جیل سے مفرور ہو چکے تھے۔ ان کے پاس ہر وقت ایک ریڈیو ہوتا تھا جو پوری آواز سے بجتا رہتا تھا۔ ایک بار جب بہت گرمی تھی تو ہمیں بھی انہوں نے "جگ" بھر کر بھنگ بھجوائی تھی۔ ہمارے سیل کا دروازہ ۵ بجے صبح کھلتا تھا۔ ۶ بجے سے نہانے اور "چائے بسکٹ" ناشتے کے بعد مشقت شروع ہو جاتی تھی اور پھر بقیہ وقت میں تاش کھیلنا اور گانا بجانا ہوتا تھا۔ سونے سے پہلے ہمیشہ ہم سب مل کر اپنا بچپن یاد کرتے تھے۔

"لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری"

ہم ذہنی طور پر چھ ماہ بلکہ اس سے بھی زیادہ کے لیے تیار ہو گئے تھے اور تمام تر "محرومیوں" کے باوجود ہمیں اس بات کا شدت سے احساس تھا۔ کہ جیل کی جدوجہد میں ہم سے وہ آگے بڑھ گئے جنہیں کوڑے کی سزا کا اعزاز نصیب ہوا۔

OO

سوال: کیا آپ نے اس وقت اپنے پستول سے گولی چلائی تھی جب کہ آپ نے اسٹین گنوں سے گولیوں کی بوچھاڑ کی آواز نہیں سنی تھی اور آپ راستے میں ٹہل رہے تھے؟

جواب: نہیں۔"

گواہ کی طرف سے اس قطعی انکار کے باوجود کہ اس نے اپنے پستول سے گولی نہیں چلائی تھی سامع بینچ نے استغاثہ کے حق میں یہ سود مند سمجھا کہ اس وعدہ معاف گواہ کی گواہی اور دیگر شریکِ جرم کے اقراری بیانات کے درمیان اس اہم تضاد سے صرف نظر کر جائے پیراگراف ۵۲۲ میں کہتی ہے:

میں اسلام اور رسولِ اکرمؐ سے عقیدت میں کسی کا محتاج نہیں

یہ دبیں غلام حسین کے جرح کے دوران اس بیان کو قطعی نظر انداز کر دیتی ہے کہ آیا اس نے پستول سے گولی چلائی یا نہیں۔ اس بیان سے یہ اس کا گولی چلانا خارج از امکان نہیں ہوتا۔"

یہ استغاثہ کے حق میں اور اپیل گزار کے خلاف شہادت کو مسخ کرنے کی محض ایک مثال ہے۔ استغاثہ کے کیس کے مطابق حقیقی واقعہ سے متعلق اس تباہ کن متن سے مفاہمت کا کوئی امکان نہ تھا۔ لیکن سامع بنچ نے ایسا ہی کیا جیسا کہ اوپر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

۲۶۔ پھر سماعت کرنے والی بنچ نے کو استغاثہ کی بعض ایسی گواہیاں نظر انداز کر دیں جو دوسرے گواہوں کی ٹھوس تفصیلات کے متضاد تھیں۔ مثال کے طور پر گواہ استغاثہ ۲۱ نے جو گواہ استغاثہ ۲ مسعود محمود کا ڈرائیور تھا مسعود محمود کی شہادت کے اس اصلاح شدہ متن کی تردید کر دی کہ ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کی صبح کو اسے (مسعود محمود کو) وزیر اعظم نے بلایا تھا اور وہ ان سے ملنے کے لیے مسٹر صادق حسین قریشی کے مکان پر گئے تھے۔ سامع بنچ نے اس گواہی کا کوئی نوٹس نہیں لیا ہے جس سے نمایاں گواہ استغاثہ، وعدہ معاف گواہ کی شہادت باطل ہو جاتی ہے۔

(۲۷) کہ اسی طرح اگر کسی گواہ استغاثہ نے کوئی ایسی بات کہہ دی جو صفائی کی حمایت میں ہو تو سماعت کرنے والی بنچ نے کسی نہ کسی بہانے اسے مسترد کر دی گواہ استغاثہ ۲۸ عاشق محمد لودھی نے کہا کہ وعدہ معاف گواہ غلام حسین کا وعدہ معاف گواہ مسعود محمود سے براہ راست رابطہ تھا اور یہ کہ جولائی ۱۹۷۴ء میں موخر الذکر کے دفتر میں تقریباً ۵-۴ منٹ تک دونوں خلوت میں گفتگو کرتے رہے تھے۔ مسعود محمود اور غلام حسین دونوں کہہ چکے تھے۔ کہ ان کے درمیان کبھی بھی ذاتی تعلق نہیں رہا تھا۔ تاہم سامع بنچ نے یہ رائے دی کہ گواہ استغاثہ ۲۸ ایک رسمی گواہ ہے اس لیے ایسی گواہی دینا اس کا کام نہیں جس سے دفاع کو رعایت ملتی ہو۔

تاہم سامع بنچ نے ایسی تمام گواہیاں تسلیم کی ہیں جو رسمی گواہوں کی طرف سے دی گئی ہوں اور استغاثہ کے حق میں جاتی ہوں۔ گواہ استغاثہ ۲۸ عاشق محمد لودھی کی گواہی کے وہ حصے بھی جو رسمی نوعیت کے نہیں تھے اور سامع بنچ کی رولنگ کے مطابق قابل اعتنا نہیں تھے لیکن استغاثہ کے حق میں جاتے تھے، اپیل گزار کے خلاف فیصلے میں محسوب کئے گئے۔ یہ اس قدر نمایاں ہے کہ مقدمے میں سامع بنچ نے دوسرے معیار کے استعمال کا قاعدہ برقرار رکھا ہے۔ اور اس نے اس اصول پر عمل کیا ہے کہ ایک ہی صورت حال میں استغاثہ کے ساتھ ایک قانون اور صفائی کے ساتھ دوسرا قانون استعمال کیا جائے۔

(۲۸) کہ سامع بنچ قانون شہادت کی دفعہ ۳۲ کی شرائط کی ترجمانی میں سنی سنائی شہادت کو تسلیم کرنے کی گمراہی میں مبتلا ہوئی ہے۔ اسسٹنٹ چیف سیکیورٹی آفیسر عبدالحمید باجوہ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس عبدالاحد اور سابق ڈائریکٹر جنرل ایف ایس ایف حق نواز ٹوانہ یہ سارے لوگ اس مقدمہ کے آغاز سے بہت پہلے ہی مر چکے تھے لیکن چند گواہوں نے استغاثہ کی شہادت میں ضروری خلا کو پر کرنے کے لیے ان مرے ہوئے لوگوں سے بیانات منسوب کر دیے۔ قانون شہادت کی دفعہ ۳۲ کی شرائط کی جو ترجمانی سامع بنچ نے کی ہے اور ان بیانات کو استعمال کیا ہے (جس سے اپیل گزار کو اختلاف ہے)، اس کے مطابق بھی بنچ نے ان مردہ اشخاص کی طرف منسوب کردہ بیانات کو کسی تجزیہ اور اس پر غور کیے بغیر کہ ان کے بیانات کا کون سا حصہ بنچ کے وضع کردہ ضابطے سے مطابقت کرتا ہے اور کون سا نہیں، قبول کرنے کی غلطی کی ہے اور اس سے بھی اپیل گزار کے کیس کو سخت نقصان پہنچا ہے۔

(۲۹) کہ کثیر یا قابل قبول شہادت کو مقدمے کے ریکارڈ پر لایا گیا ہے جسے قانون شہادت کی دفعہ ۷، اور/یا دفعہ ۱۱ کے تحت بھی ریکارڈ پر نہیں لایا جا سکتا تھا۔

(۳۰) جب کبھی بھی ناقابل قبول نوعیت کی شہادت مقدمے کے ریکارڈ پر لائی گئی۔ وکیل صفائی کے اعتراضات کو بعض اوقات انہیں ضبط تحریر میں لانے کے باوجود کسی حکم کے بغیر نمٹا یا گیا۔ بعض صورتوں میں اعتراضات کو مسترد کرنے کے احکام جاری کیے گئے تو اس استرداد کے حق میں کوئی سبب نہیں بتایا گیا۔

(۳۱) کہ استغاثے کے بعض گواہوں کے زبانی بیانات خود استغاثے کے پیش کردہ ریکارڈ اور دستاویزی ثبوت کے برعکس ہیں۔ اس کے باوجود استغاثے نے زور دیا کہ اس کا اپنا ریکارڈ اور دستاویزات مسترد کر دیے جائیں اور گواہوں کے زبانی بیانات قبول کر لیے جائیں سماعت کرنے والی بنچ نے سادہ طریقے پر ان درخواستوں کو منظور کر لیا۔ اور وہ تمام دستاویزات مسترد کر دیں جو صفائی کے حق میں تھیں۔

(۳۲) کہ زبانی بیانات کے ذریعے استغاثے نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک مخصوص تاریخ کو لکھی جانے والی دستاویز حقیقتاً اس تاریخ کو نہیں لکھی گئی تھی۔ اور ایسی زبانی شہادت جو دستاویز کے مواد کے برعکس تھی قبول کر لی گئی کیونکہ دستاویزات خود صفائی کے حق میں جاتی۔

(۳۳) کہ استغاثے کے گواہوں اور دوسرے فریقین کے بیانات ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۶۴ کے تحت قلمبند کرتے وقت ذیلی دفعہ ۱-۲۱ لازمی تقریبات کو دانستہ طور پر نظر انداز کر دیا گیا جس سے اپیل کنندہ کو سخت نقصان پہنچا اور سماعت کرنے والی بنچ ایسے بیانات اور شریک ملزمان کے اقبالی بیانات پر غور کرتے وقت اس بے قاعدگی پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ذیلی دفعہ ۱-اے میں درج ہے۔

"ایسا کوئی بیان کوئی ایسا مجسٹریٹ ملزم کی موجودگی میں قلمبند کر سکتا ہے اور ملزم کو بیان دینے والے گواہ پر جرح کا موقع دیا جا سکتا ہے"۔

(۳۴) کہ سماعت کرنے والی بنچ نے غیر قانونی طور پر شریک ملزموں کے ان اقبالی بیانات پر غور کیا جو انہوں نے عدالت کے روبرو ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۳۴۲ کے تحت دیئے تھے، جس کے بارے میں اپیل کنندہ کو کسی قسم کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ اور اس حقیقت کے پیش نظر اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا تھا کہ اس دفعہ کے تحت اپیل کنندہ کا بیان دوسرے شریک ملزمین سے پہلے لیا جا چکا تھا یہ انصاف کی ناکامی پر منتج ہوا۔

(۳۵) کہ سماعت کرنے والی بنچ نے غیر قانونی طور پر اور بغیر کسی جواز کے بارود اور اسلحہ کے ماہر کی منفی رپورٹ کو مسترد کر دیا جس نے استغاثے کے مقدمے کو ملیامیٹ کر دیا تھا اور یہ فیصلہ کرنے کی غلطی کی ہے کہ اس جرم کے ارتکاب میں مبینہ طور پر استعمال ہونے والی گنیں برآمد نہیں ہوئی تھیں۔ سماعت کرنے والی بنچ نے استغاثے سے یہ دریافت کرتے

یحییٰ بختیار اور دوست محمد اعوان سپریم کورٹ میں

کی پرواہ نہیں کی کہ اگر بارودی اسلحہ کے ماہر کو بھیجی جانے والی گنوں کا تعلق تقابل کے مقصد سے نہیں تھا۔ تب آخر انہیں کس غرض سے جرم سے متعلق خولوں کے ساتھ بارودی اسلحہ کے ماہر کو بھیجا گیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ استغاثہ نے تھرڈ بٹالین سے متعلق تمام ۲۵ گنیں بھیجی تھیں جن میں سے دو گنیں مبینہ طور پر اس جرم کے ارتکاب میں استعمال کی گئی تھیں۔ استغاثے کو توقع تھی کہ موجودہ مارشل لاء کی فضا میں اس معاملے میں موافق رپورٹ حاصل کر لے گا لیکن جب رپورٹ منفی نکلی تو اس نے ہر ممکن کوشش کی۔ ایسی تمام دستاویزات اور شہادتوں کو دبا دیا جائے جن سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ تھرڈ بٹالین سے تعلق رکھنے والی گنیں استغاثے کے مقدمے کو ثابت کرنے کی خاطر معائنے کے لیے بھیجی گئی تھی۔

(۳۶) (i) کہ اپیل کنندہ کے محرک کے بارے میں بھی استغاثے کی شہادت متضاد ہے۔ ایک طرف تو استغاثے کا مقدمہ یہ ہے کہ ۳ر جون ۱۹۷۴ء کو قومی اسمبلی سے اپیل کنندہ کے خطاب کے دوران احمد رضا قصوری کی مداخلت نے اس جرم کے لیے محرک فراہم کیا۔ دوسری طرف ریکارڈ پر ایسی شہادت لائی گئی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس واقعے کا بہت پہلے سے محرک موجود تھا۔

(ii) جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ایف آئی آر اور چارج میں بتایا گیا تھا کہ قومی اسمبلی میں ۳ر جون ۱۹۷۴ء کے واقعے نے جرم کے لیے محرک فراہم کیا تھا لیکن استغاثے کی پیش کردہ دوسری شہادت اس سے متصادم ہے۔ اور نشاندہی کرتی ہے کہ اپریل ۱۹۷۴ء میں مسعود محمود کو ترغیب دی گئی۔ تنگ کیا گیا۔ دھمکی دی گئی اور مجبور کیا گیا کہ فیڈرل سیکیورٹی فورس کے ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ قبول کریں تاکہ وہ احمد رضا قصوری کو ختم کرنے کے اپیل کنندہ کے مبینہ منصوبے پر عملدرآمد کیا۔ ایسی نمایاں عدم مطابقتوں نے سماعت کرنے والی بنچ سے کوئی توجہ حاصل نہیں کی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ بنچ نے محرک کے بارے میں چارج اور ایف آئی آر میں تسلیم کردہ استغاثے کی شہادت کو نظر انداز کیا گیا ہے اس کے برعکس بنچ نے پیراگراف ۵۶۳ میں قرار دیا ہے کہ اپیل کنندہ "احمد رضا قصوری کی اس پر تنقید کی سبب کینے کی وجہ سے ایک محرک رکھتا تھا۔" احمد رضا قصوری کی تنقید میں اس نام نہاد کینے کا تعلق ۳ر جون ۱۹۷۴ء سے بہت عرصہ پہلے کی قومی اسمبلی میں ان کی تقریروں سے ہے۔

(iii) سماعت کرنے والی بنچ نے ایسے محرک پر زور دے کر خود کو غلط راہ پر ڈالا ہے جو نہ ممکن تھا نہ اس کی نوعیت ایسی تھی۔ جو ایسے فرد کے خلاف مبینہ جرم کا تقاضا کرتی ہو جو بقول چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر "غیر اہم شخص" تھا۔

(iv) سیاست میں اعلیٰ عہدوں پر فائز افراد کو بے حساب زہر آلود قسم کی تنقید برداشت کرنی پڑتی ہے اپیل کنندہ کافی عرصے سے حکومت میں ہونے کی بنا پر اس کا عادی تھا۔ پاکستان کی قومی اسمبلی کا گذشتہ اٹھارہ سالہ ریکارڈ اس بات کا ثبوت دے گا کہ قومی اسمبلی کے کہیں زیادہ اہم اراکین اپنی تقریروں میں اس سے زیادہ کینہ پروری کے ساتھ اپیل کنندہ پر تنقید کرتے رہے ہیں۔ اس کے باوجود اس نے ان اراکین اسمبلی سے خوشگوار تعلقات رکھے۔

(v) محرک پر غور کرتے ہوئے سماعت کرنے والی بنچ احمد رضا قصوری کے کردار اور طمع کا اندازہ کرنے میں ناکام رہی جو سارا وقت حکومت میں عہدہ حاصل کرنے یا دوسرے فوائد حاصل کرنے کے لیے اپیل کنندہ سے بھیک مانگتا رہا۔ اسے تنگ کرتا رہا اور بلیک میل بھی کرتا رہا۔

(vi) اگر اپیل کنندہ کو ذرا برابر بھی احساس جرم ہوتا تو احمد رضا قصوری کو حکومت میں کوئی معمولی عہدہ دے کر خاموش کرنا اس کے لیے دنیا میں سب سے آسان بات ہوتی۔ مگر اپیل کنندہ نے انہیں قومی یا صوبائی اسمبلی کے انتخابات لڑنے کے لیے پارٹی ٹکٹ کے لیے موزوں نہیں سمجھا جبکہ اپیل کنندہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے سینکڑوں امیدواروں کو ٹکٹ دے سکتا تھا۔ قومی اسمبلی کے لیے ٹکٹ دینے سے انکار کرنے کے بعد بھی احمد رضا قصوری نے خوشامد اور بلیک میلنگ سمیت اپنی چالیں اس امید پر جاری رکھیں کہ شاید سینٹ کے انتخابات میں ان پر توجہ دی جائے لیکن یہ بھی خارج از بحث تھا۔ یہ ان کی مایوسی اور اپریل ۱۹۷۷ء میں دوبارہ اپیل کنندہ کی پارٹی چھوڑنے کی وضاحت کرتی ہے۔ ان تمام باتوں پر سماعت کرنے والی بنچ نے غور نہیں کیا۔

(vii) احمد رضا قصوری کی یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ کئی افراد ایسے تھے جو ان کے دشمن تھے اور جو اسلام آباد کے واقع کے ساتھ ہی ساتھ لاہور کے واقعے کے بھی ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے اپیل کنندہ کو انہیں ہلاک کرنے کے محرک سے بری قرار دیا تھا جیسا کہ مسٹر جسٹس شفیع الرحمٰن کے ٹربیونل کی رپورٹ سے ظاہر ہے جو ان کے والد کی ہلاکت کے معاملے کی تحقیقات کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اسی طرح ۲۴ر اگست ۱۹۷۴ء کے اسلام آباد کے واقعے کے بعد پولیس کے روبرو اپنے بیان میں انہوں

نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔ یقیناً انہوں نے عدالت کے روبرو اپنے بیان میں اس سے انکار کیا اور سماعت کرنے والی بنچ نے صرف تکنیکی وجوہات کی بنا پر اس انکار کو قبول کر لیا کہ ٹربیونل کی رپورٹ قابل قبول نہیں اور اسلام آباد کے واقعہ کے بعد پولیس کے روبرو بیان جو صفائی کو خود استغاثہ نے فراہم کیا تھا ثابت نہیں ہوا۔

(۲۲ ہ) کہ سماعت کرنے والی بنچ نے غیر قانونی طور پر یہ قرار دیا کہ مسٹر جسٹس شفیع الرحمن ٹربیونل کی رپورٹ قابل قبول نہیں۔ اس کے باوجود بنچ نے اس کے مواد پر انحصار کیا۔ جیسا کہ استغاثے کے گواہ ۳ سعید احمد نے الزام لگایا کہ رپورٹ مخالفانہ تھی اس لیے اپیل کنندہ نے اسے شائع کرنے کی اجازت نہیں دی۔ عدالت اپیل کنندہ کی مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۷۷ء کی درخواست بھی غیر قانونی طور پر مسترد کر دی جس میں گذارش کی گئی تھی کہ مسٹر جسٹس شفیع الرحمن کو بیان دینے کے لیے بطور گواہ طلب کیا جائے تاکہ رپورٹ کے پیراگراف ۱۵ میں محولہ احمد رضا قصوری کے بیان کی ثانوی شہادت دی جا سکے۔ اسی طرح بنچ نے اسلام آباد کے واقعے کے بعد پولیس کے روبرو دیئے گئے۔ احمد رضا قصوری کے بیان کو استغاثے کے گواہ ۲۳ کے ذریعے ثابت کرنے کی اجازت نہ دے کر غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔

(۲۲ ا) کہ ایک طرف تو استغاثہ مصر ہے کہ قومی اسمبلی میں ۳ جون ۱۹۷۴ء کا واقعہ اپیل کنندہ کے لیے محرک کی تشکیل کرتا ہے۔ اس کے باوجود ۲۴ اگست ۱۹۷۴ء کو یعنی اسمبلی کے واقعے کے ۶/۷ ہفتے بعد جب مبینہ طور پر احمد رضا قصوری پر گولیاں چلائی گئیں تو انہوں نے اپیل کنندہ کو ملوث نہیں کیا۔ نہ ہی انہوں نے یہ کہا کہ اپیل کنندہ کے ایماء پر ان پر گولیاں چلائی گئیں۔ انہوں نے کئی افراد کا ذکر کیا جو گولیاں چلانے کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ قومی اسمبلی کے واقعے کے فوری بعد پیش کی جانے والی تحریک استحقاق میں انہوں نے ایسا کوئی الزام نہیں لگایا۔ اس کے پیش نظر یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ لاہور کے واقعے کے بعد ایف آئی آر تقریباً تین گھنٹے تک درج نہیں کرائی گئی اور اب محسوس ہوتا ہے کہ صلاح مشورے ہوتے اور اس کے بعد اپیل کنندہ کا نام ایف آئی آر میں شامل کیا گیا۔

(۲۲) احمد رضا قصوری نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ انہوں نے ۱۹۷۲ء کے اوائل میں اپیل کنندہ سے سمجھوتہ کر لیا تھا کیونکہ اپیل کنندہ نہ صرف صدر بلکہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی بن گیا تھا۔ اور خوف کی بنا پر انہیں اپیل کنندہ کی طرف وہ ظاہری رویہ اپنانا پڑا۔ اور جیسے ہی مارشل لاء اٹھا لیا گیا تو انہوں نے اپیل کنندہ کو دوبارہ اپنے دانت دکھائے۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے ان کے خوف کو سامنے رکھتے ہوئے۔ اب یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ موجودہ مخالفانہ فضاء میں جس میں پی ایم ایل اے نے بار بار اسی مقدمے میں اپیل کنندہ کو "قاتل" کہا ہے اور شہادتیں گھڑنے اور جوڑ توڑ کرنے کے لیے مارشل لاء کی مشینری حرکت میں لائی گئی تھی۔ سرکاری ملازمین کو تنگ کیا گیا اور ان پر دباؤ ڈالا گیا کہ جھوٹے بیانات دیں احمد رضا قصوری نے کیونکہ نہ صرف لاہور کے واقعے کی ذمہ داری ڈالی بلکہ اسلام آباد کے واقعے کے بعد پولیس کے روبرو دیئے گئے اپنے بیان اور مسٹر جسٹس شفیع الرحمن کے ٹربیونل کے سامنے دیئے گئے اپنے بیان سے بھی انکار کیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں ۱۹۷۱ء کے واقعے کے سبب کی بھی ذمہ داری اپیل کنندہ پر ڈالی گو کہ اس واقعے کا ریکارڈ صاف صاف نشاندہی کرتا ہے کہ وہ یعقوب مان اور قصور کے دوسرے مقامی لیڈروں سے دشمنی رکھتے تھے۔

(۲۳ ہ) کہ وقت نے پوری طرح یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ جنرل ضیاء الحق چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نہ صرف، اپیل کنندہ کو ذاتی مخالف کی حیثیت سے مٹا دینے اور اپنی مطلق العنانہ حکومت کو جاری رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بلکہ اب انہوں نے اپنے مارشل لاء کی ایک نظریاتی یا فلسفیانہ تشریح کرنی شروع کی ہے۔ انہوں نے پچھلے دنوں خود کو دائیں بازو والا قرار دیا ہے جیسا کہ ہٹلر، مسولینی اور فرانکو نے خود کو دائیں بازو والا قرار دیا تھا۔ اور جو کوئی بھی سماجی انصاف، قومی ملکیت میں لینے اور عام آدمی کی فلاح و بہبود میں یقین رکھتا ہے وہ اسے بائیں بازو والا قرار دے رہے ہیں۔ وہ یہ کہنے کی حد تک گئے ہیں کہ سارے بائیں بازو والے ایک جیسے ہیں اور یہ کہ دائیں بازو والوں اور بائیں بازو والوں میں جنگ جاری ہے۔ انہوں نے کمیونسٹوں، سوشلسٹوں، لبرلوں اور ان تمام لوگوں کو جو منصفانہ رویے اور عام آدمی کے ساتھ منصفانہ سلوک پر یقین رکھتے ہیں۔ ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے اور ان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ صرف اپیل کنندہ کے خلاف ذاتی مخاصمت نہیں ہے بلکہ انہوں نے اس کے خلاف جنگ شروع کر رکھی ہے کیونکہ بقول ان کے اپیل کنندہ بائیں بازو کی طاقتوں کی نمائندگی کرتا ہے جب کہ وہ خود (جنرل ضیاء الحق) دائیں بازو والوں کو کاز، نجی شعبے کی کاز، قومی ملکیت کو ختم کرنے کی کاز، سخت لیبر پالیسی کی کاز، غیر محدود نجی ملکیت کی کاز کے چیمپئن ہیں اور یہ سب کچھ اسلام کے نام پر۔ یہ بات وضاحت کرتی ہے کہ وہ کیوں صرف اپیل کنندہ بلکہ اس کے خاندان، اس کے رفقائے کار اور اس کی سیاسی جماعت کے خلاف ہیں۔ سی ایم ایل اے اسلام کو بدنام کر رہے ہیں۔ وہ اسلام کے نام سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں ان کی اسلام کی تشریح بے راہ ہے۔ اسلام ایک روشن خیال اور ترقی پسند مذہب ہے۔ یہ جامد نہیں ہے، یہ فعلیاتی ہے۔ یہ منصفانہ روش اور سماجی انصاف کے حق میں ہے۔ یہ عام آدمی کے فلاح و بہبود کے حق میں ہے۔ یہ اس کے حق میں ہے جس کی وضاحت قائد اعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال نے کی ہے۔

اور اپیل کنندہ اسلام اور رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عقیدت میں خود کو کسی سے کم نہیں سمجھتا۔ کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے یہ وضاحت کرنے میں بڑی تکلیف برداشت کی ہے کہ کئی ممالک اور حکومتوں کے سربراہوں کی جانب سے صدر کے سزائے موت میں تخفیف کے اختیار کے استعمال کی اپیلیں اس مرحلے پر نامناسب ہیں کیونکہ اپیل کنندہ کی اپیل سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے۔ وہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس اختیار کا اس اپیل سے کوئی تعلق نہیں جس پر سپریم کورٹ غور کر رہا ہے۔ یہ اختیار کسی بھی وقت استعمال ہو سکتا ہے چاہے مقدمہ زیر سماعت ہو یا اس کا حتمی فیصلہ ہو چکا ہو جیسا کہ خود انہوں نے نیپ کے لیڈروں کے مقدمے میں کیا ہے جو حیدرآباد اسپیشل کورٹ میں زیر سماعت تھا۔ مؤدبانہ گذارش

> سامع بنچ نے
> اقرارکا بیانات کے
> درمیان اہم تضاد
> سے صرفِ نظر
> سُود مند نہیں

ہے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے کبھی بھی مقدمے کے زیرِ سماعت ہونے کی پرواہ نہیں کی۔ خاص طور پر اس وقت جب یہی مقدمہ لاہور ہائی کورٹ میں اپیل کنندہ کے خلاف زیرِ سماعت تھا۔ انہوں نے بار بار غیر ملکی اور قومی اخباری نمائندوں سے کہا کہ اپیل کنندہ قاتل اور خائن تھا۔ اب بھی جب کہ اپیل کنندہ کی اپیل سپریم کورٹ میں زیرِ سماعت ہے انہوں نے غیر ملکی اخباری نمائندوں سے یہ کہہ کر اپیل کنندہ کے مقدمے کو نقصان پہنچانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی کہ اپیل کنندہ تیز چالباز ہے اور یہ کہ ہائی کورٹ میں مقدمے کی کارروائی منصفانہ جائز اور قانون کے مطابق تھی! ایسی بات جو اپیل کنندہ کی اپیل میں معرضِ بحث میں ہے۔

(۳۸) کہ سماعت کرنے والی بنچ نے ضرورت سے زیادہ آسان بناتے ہوئے یہ قرار دیا کہ استغاثے کے گواہوں کو اپیل کنندہ کے خلاف مخاصمت نہیں تھی اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اس مقدمے میں جھوٹی گواہی دیتے۔ سماعت کرنے والی بنچ نے بعض گواہوں کے مسٹر جسٹس شفیع الرحمٰن ٹریبونل کے سامنے دیئے گئے بیانات بدلنے کے لیے اس عذر کو تسلیم کیا کہ اس وقت حالات ایسے تھے کہ وہ جھوٹے بیانات دینے پر مجبور تھے۔ ریکارڈ پر ایسی کوئی بات نہیں جس سے یہ الزام ثابت ہوتے ہوں کہ اس وقت ایسے حالات موجود تھے سماعت کرنے والی بنچ یہ دیکھنے میں ناکام رہی کہ کوئی بھی فرد بادی میں نہیں تھا۔ کسی گواہ کو ہفتوں یا مہینوں کے لیے نظربند نہیں کیا گیا۔ کسی گواہ کو ملازمت سے برطرف نہیں کیا گیا یا انہیں کسی طریقے سے حراساں نہیں کیا گیا جب وہ مسٹر جسٹس شفیع الرحمٰن کے ٹریبونل کے سامنے شہادت دے رہے تھے۔ البتہ یہ بات مکمل طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ مخاصمت اور عناد کی ایسی فضا ۵ رجولائی ۱۹۷۷ء سے موجود تھی۔ اور اپیل کنندہ کے خلاف ہائی کورٹ میں مقدمے کی کارروائی کے دوران جاری رہی اور آج تک جاری ہے۔ اسلام کے چیمپئنوں کی طرف سے سرکاری ملازمین کو ڈرایا، دھمکایا، دباؤ ڈالا اور مجبور کیا گیا کہ اپیل کنندہ کے خلاف جھوٹی گواہی دیں۔ ایک حلف نامہ جس پر "H" کا نشانِ شناخت لگایا گیا ہے پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ایک ایسے افسر کی مثال پیش کی جائے جس نے ہدایات پر عمل کرنے اور جھوٹی گواہی دینے سے انکار کیا جس کے نتیجے میں اسے مہینوں قید تنہائی کی سزا بھگتنی

پڑی اور اسے سرسری طور پر ملازمت سے برطرف کر دیا گیا حالانکہ وہ اٹھائیس سالہ بہترین ملازمت کا شاندار ریکارڈ رکھتا تھا۔

(۳۹) کہ سماعت کرنے والی بنچ نے فیصلے میں کئی پیراگراف ملک کے اسلامی کردار اور اسلام کے مساوات اور قانون کے تصور کے لیے وقف کیے ہیں۔ اس نے نشاندہی کی ہے کہ اسلام کے خلیفۂ اول نے حکمرانوں کے غلط اقدامات پر عوامی تنقید کی دعوت دی۔ لیکن سماعت کرنے والی بنچ یہ محسوس کرنے میں ناکام رہی کہ خلیفۂ اوّل اسلامی ریاست کے صرف انتظامی سربراہ ہی نہیں بلکہ مفتیٔ اعظم (چیف جسٹس) بھی تھے۔ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی پر خفیہ طور پر مقدمہ چلایا جائے۔ اسلام میں بند کمرے میں کارروائی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جیسا کہ مولانا مودودی کی ایک تقریر کے حسبِ ذیل اقتباس سے دیکھا جا سکتا ہے:-

"عدالتی نظام میں جاری و ساری اصول یہ تھا کہ نہ صرف انصاف کیا جائے بلکہ یہ دکھایا بھی جائے انصاف ہو رہا ہے۔ تمام مقدمات کی سماعت کھلی عدالت میں ہوتی تھی اور عدالتی نظام میں خفیہ کارروائی کی کوئی مثال نہیں ہے۔ تاریخ میں ایک مشہور واقعہ ہے کہ فتح مکہ سے قبل رسول اللہ کے ایک صحابی نے کافروں کو ایک خط لکھا اور ان پر عنقریب ہونے والے حملے کی اطلاع دی۔ یہ خط برآمد کر لیا گیا۔ یہ جاسوسی کا ایک کھلا ہوا معاملہ تھا۔ عہدِ جدید کے لوگ کہیں گے کہ ایسے خطرناک مقدمے کی سماعت بند کمرے میں ہونی چاہیئے تھی لیکن رسولِ اکرمؐ نے ایک مسجد میں کھلی کارروائی کی۔"

(۴۰) سماعت کرنے والی بنچ نے استغاثے کی شہادت مکمل ہونے کے بعد بند کمرے میں کارروائی کی۔ بند کمرے میں کارروائی کرنے کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اپیل کنندہ سماعت کرنے والی بنچ پر تنقید کرے گا اور اس کی غیر جانبداری پر حملہ کرے گا۔ نتیجتہً کارروائی بند کمرے میں اس جواز پر جاری رہی کہ گڑبڑ کا اندیشہ تھا حالانکہ یہ رائے قائم کرنے کے لیے کوئی ثبوت یا جواز نہیں تھا۔

(۴۱) کہ سماعت کرنے والی بنچ نے کئی موقعوں پر وکیل، وہ خود اپیل کنندہ توہینِ عدالت کے تحت اقدام کی دھمکیاں دیں۔ یہاں تک کہ اس نے فیصلے میں اس رائے کا اظہار کیا ہے توہینِ عدالت کا قانون جو عدالت کو اختیار دیتا ہے کہ توہین کرنے والے کو چھ ماہ قید کی سزا دے بے وقعت ہے۔ اور سفارش کی ہے کہ اس سقم کو دور کرنے کے لئے ضروری قانون منظور کیا جائے۔ اس عدالت کی سو سال سے زیادہ کی تاریخ میں کسی جج نے اس قسم کی سفارش کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس عدالتِ عالیہ کے لئے یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اپیل کنندہ کے مقدمے کو نقصان پہنچانے اور پہلے سے فیصلہ دینے کی صورت میں جنرل ضیاء الحق کی طرف سے عدالت کی توہین کے ارتکاب کی طرف ایک درخواست کے ذریعے واضح طور پر سماعت کرنے والی بنچ کی توجہ مبذول کرائی گئی لیکن سماعت کرنے والی بنچ نے جو ویسے تو اس بات پر زور دیتی رہی ہے کہ کوئی فرد قانون سے بالا نہیں ہے اور اسلام میں مساوات کے تصور پر بحث کی ہے، اس درخواست کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور اس معاملے میں درخواست پر کوئی حکم صادر کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ سماعت کرنے والی عدالت کی جانب سے برتے جانے والے دوہرے معیار دوبارہ نمایاں ہو گئے کہ مساوات کے تصور کا انطباق سابق منتخب وزیرِ اعظم پر ہوتا تھا لیکن چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو، یقیناً دوسروں سے زیادہ مساوی تصور کیا جاتا تھا۔

(۴۲) خود استغاثے کی شہادت سے یہ بات

واضح ہے کہ مبینہ سازش لاہور کے واقعے کے بعد یعنی ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کو اختتام کو پہنچ گئی۔ استغاثے کے گواہ ۲۔ وعدہ معاف، مسعود محمود نے صفحہ ۷۵ پر اپنی گواہی میں کہا۔

" جہاں تک مجھے یاد ہے۔ میں اسی سہ پہر ملتان سے روانہ ہوا۔ ہماری راولپنڈی واپسی پر مجھے مسٹر بھٹو نے طلب کیا۔ وہ چڑچڑے اور مشتعل تھے انہوں نے کہا کہ اصل کام ابھی ہونا باقی ہے۔ میں نے ان سے کہا "آپ کے ایما پر آپ کے اپنے قائم کردہ ایک خیال پر عمل کیا گیا اور میرے توسط سے وہ میاں عباس تک پہنچا جنہیں آپ کی ہدایات پہلے ہی میرے پیشرو کے توسط سے پہنچ چکی تھیں اور یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ آپ سے مجھ سے اور میرے ماتحتوں سے اللہ تعالیٰ حساب لے گا، لیکن اب میں مزید اس قسم کے احکامات پر عمل نہیں کروں گا"۔

پھر صفحہ ۸۵ پر اُس نے کہا۔

" یہ بات میرے علم میں نہیں ہے کہ ایف ایس ایف کی طرف سے ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کے بعد احمد رضا قصوری کی جان لینے کی کوئی کوشش کی گئی۔ کیونکہ احمد رضا قصوری کے پیچھے لگنے کے لئے وزیراعظم کے حکم کے باوجود میں نے مسٹر محمد عباس سے کہہ دیا تھا کہ یہ نہیں کیا جائے گا"۔

مبینہ اور واحد اس سازشی مسعود محمود کے اس واضح بیان کے پیش نظر سماعت کرنے والی بینچ کے لئے کوئی سبب نہیں تھا کہ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ لاہور کے واقعے کے بعد بھی سازش جاری رہی۔ اس کے پیش نظر اپیل کنندہ کے بعد کے مبینہ رویے سے متعلق شہادت ناقابل قبول تھی اور اسے ریکارڈ پر نہیں لایا جانا چاہیے تھا یا کسی بھی صورت میں اسے زیر غور نہیں لایا جانا چاہیے تھا۔

(۳۴) کہ سرکاری خط و کتابت اور دوسری دستاویزات جن پر استغاثے نے انحصار کیا ہے ان سے غلط معنی نکالے گئے ہیں اور ان کی غلط تشریح کی گئی ہے جس سے اپیل کنندہ کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ سماعت کرنے والی بینچ نے خود کہا ہے کہ یہ دستاویزات بذات خود ملوث کرنے والی نوعیت کی نہیں ہیں۔ اور اس کے باوجود جھوٹی شہادتوں کی روشنی میں اور اندازوں کی بنیاد پر ان کی تشریح کرتے ہوئے سماعت کرنے والی بینچ نے ان سے بھیانک معنی اخذ کئے ہیں۔ مثال کے طور پر احمد رضا قصوری کے دورۂ کوئٹہ کے بارے میں ایف ایس ایف کے افسروں کے درمیان آنے جانے والے خطوط صرف روزمرہ کی نوعیت کے تھے۔ انٹیلی جنس کے افسروں کے درمیان خطوط کا تبادلہ عام معمول ہے پھر بھی سماعت کرنے والی بینچ نے ان پر اپیل کنندہ کے خلاف ثابت کرنے والی شہادت حصوں پر انحصار کیا ہے۔ اسی طرح دوسری ایسی دستاویزات جو بطور شہادت قابل قبول بھی نہیں، نہ تو مستند تھیں نہ مصدقہ، ان پر نہ صرف انحصار کیا گیا ہے بلکہ اپیل کنندہ کے مفاد کے خلاف ان کی غلط طور پر تشریح کی گئی ہے۔

استغاثے کا مقدمہ یہ ہے کہ یکم فروری ۱۹۷۵ء کو سعید احمد خان نے ایک نوٹ (ای ایس پی۔ ڈبلیو ۳/۳۔ ڈی) انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ کے ڈائریکٹر جنرل کو بھیجا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ایس ایس پی اصغر خان اور تحقیقاتی افسر ڈی ایس پی ملک محمد وارث نے ۲۹ جنوری ۱۹۷۵ء کو مسٹر جسٹس شفیع الرحمٰن کے ٹریبونل کے روبرو جو شہادت قلم بند کروائی ہے۔ اسے اخبارات میں تشہیر دی جائے۔ اس دستاویز کی ایک نقل جو وزیراعظم کو ۲ فروری ۱۹۷۵ء کو پہنچی اس پر وزیراعظم نے صرف دستخط کئے ہیں۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ وہ سعید احمد کی تجویز کو منظور کرتے ہیں لیکن سماعت کرنے والی بینچ نے اس دستاویز اور اس کی نقل پر وزیراعظم کے دستخط سے معنی نکالتے ہوئے اسے ثابت شدہ حقیقت (پیراگراف ۵۰۷) قرار دیا ہے کہ وزیراعظم نے سعید احمد کی تجویز منظور کر لی تھی۔ اس غلط نتیجے سے سماعت کرنے والی بینچ نے دوسرے غلط نتیجے پر جست لگائی تاکہ دکھا سکے کہ اس مواد کی تشہیر میں وزیراعظم کو گہری دلچسپی تھی۔ فیصلہ مزید کہتا ہے کہ ان کی منظوری کے نتیجے میں ان دو پولیس افسروں کے مسٹر جسٹس شفیع الرحمٰن کے ٹریبونل کے روبرو دیئے گئے بیانات کی تشہیر کی گئی۔ تجویز یکم فروری ۱۹۷۵ء کو سعید احمد کی طرف سے پیش کی گئی۔ وزیراعظم نے اس نوٹ کی نقل پر ۲ فروری ۱۹۷۵ء کو صرف دستخط کئے۔

نوٹ کی اس نقل سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے خود اس کی استغاثے کی اپنی پیش کردہ دوسری دستاویز (ای ایس۔ پی۔ ڈبلیو ۳/۳۔ الف) سے تردید ہو جاتی ہے جس کے ذریعے انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ نے سعید احمد کو مطلع کیا کہ اصغر خان اور ملک محمد وارث کے بیانات کو پہلے ہی ۳۰ جنوری ۱۹۷۵ء کو تشہیر مل چکی ہے۔

سیدھی سادی دستاویزات سے غلط مطلب نکالنے اور غلط تشریح کرنے اور انہیں بھیانک معنی پہنانے کی مذکورہ بالا صرف ایک مثال ہے۔

کہ اپیل کنندہ کے بعد کے رویے کا ایک پہلو جسے فاضل سماعت کرنے والی بینچ نے کافی اہمیت دی ہے یہ ہے جسے وہ احمد رضا قصوری حفاظتی انتظامات اور عبدالحمید باجوہ کی اہمیتی توڑ کر ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کے واقعے کے بعد سازش پر عمل کرنے کی کوشش کہتی ہے۔ سماعت کرنے والی بینچ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ عبدالحمید باجوہ احمد رضا قصوری کو غیر مسلح اور بغیر حفاظت پانا چاہتے تھے تاکہ وہ ان پر حملہ کر کے انہیں ختم کر دیں۔ استغاثے کے مقدمے کی روشنی میں ریکارڈ کا ایک سرسری جائزہ بھی اپیل کنندہ کے شہادت کے اس حصے سے جوڑنے کی غلط کوشش کو ظاہر کر دے گا۔ یہ کسی کا مقدمہ نہیں ہے کہ مرحوم عبدالحمید باجوہ کا مبینہ سازش سے کوئی تعلق تھا۔ کہ رپورٹ (ای ایس پی ڈبلیو ۱/۲۸) جو استغاثے کے گواہ ۲۸۔ عاشق محمد لودھی نے پیش کی ہے وہ یا تو اپیل کنندہ کے ایماء پر حاصل کی گئی ہے یا یہ کبھی انہیں دکھائی گئی تھیں۔

یہ بات شہادت میں موجود ہے کہ احمد رضا قصوری نے صوبہ سرحد سے چند افراد کو اپنے بندوقچیوں کی حیثیت سے ملازم رکھا تھا۔ اور ان میں سے چند کو ان کی رہائش گاہ پر متعین کیا گیا تھا۔ قواعد کے برخلاف احمد رضا قصوری کا یہ بندوقچی نہ صرف اسمبلی کی عمارت میں مسلح جایا کرتا تھا بلکہ مہمانوں کی گیلری اور کیفے ٹیریا میں بھی جایا کرتا تھا۔ یہ عبدالحمید باجوہ کے متعینہ معمولی فرائض کے دائرے میں تھا کہ وزیراعظم کی حفاظت کے ابتدائی انتظامات کا دریہ پتہ چلائیں بندوقچی کون تھا۔ جسے احمد رضا قصوری بار بار دی جانے والی اپنی دھمکیوں پر عملدرآمد کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔ تاکہ اپنے

والدہ کی موت کا انتقام لے سکیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جو عدالت کے ریکارڈ پر بھی موجود ہے۔ اس بات کی نشاندہی ضروری ہے کہ جب اسمبلی کا اجلاس جاری رہتا تو وزیر اعظم اکثر اسمبلی آیا کرتے تھے۔

یہ دستاویز وزیر اعظم کو بھیجی تک نہیں گئی تھی۔ یہ رپورٹ قومی اسمبلی کے اسپیکر اور راولپنڈی رینج کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کو بھیجی گئی تھی جو حفاظتی انتظامات کے ذمہ دار تھے۔

(۴۶) کہ استغاثے کے گواہ ۴۳، عبدالحئی نیازی کی شہادت ناقابل قبول تھی۔ کیونکہ ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۶۱ کے تحت قلمبند شدہ اس کا سابقہ بیان صفائی کو فراہم نہیں لیا گیا تھا۔ تحقیقاتی افسر استغاثے کے گواہ ۴۱، ایف آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے اپنی شہادت میں تسلیم کیا ہے کہ پولیس ڈائریوں میں اس کا بیان موجود تھا۔ ویسے بھی اس گواہ نے تحقیقاتی ٹریبونل کے روبرو اپنے سابقہ بیان میں جو ٹھوس اضافے کیے ہیں ان کے پیش نظر اس کی شہادت کسی وقعت کے لائق نہیں۔

(۴۷) اسی طرح دونوں سلطانی گواہوں، مسعود محمود اور غلام حسین کے بیانات جو پولیس نے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۶۱ کے تحت قلمبند کیے تھے فراہم نہیں کیے گئے۔ اس نے بھی اپیل کنندہ کے مقدمہ کو نقصان پہنچایا اور ان کی گواہیوں کو ناقابل قبول بنا دیا۔

(۴۸) کہ سماعت کرنے والی بنچ غلط طور پر اس نتیجے پر پہنچی کہ اس معاملے میں سعید احمد کو ہدایات دیتے یا کسی اور طریقے پر تحقیقاتی ادارے کے کام میں مداخلت کرکے یا مسٹر جسٹس شفیع الرحمن کے ٹریبونل کے روبرو ہونے والی کارروائی پر اثر انداز ہو کر اپیل کنندہ نے تحقیقاتی افسروں کو غلط راہ پر ڈالنے کی کوششیں کیں۔ ایسے نتیجے تک پہنچنے کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ خود سعید احمد کے کہنے کے مطابق اپیل کنندہ پر پہلی بار یہ الزام لگا کہ اس نے مبینہ طور پر جنوری ۱۹۷۵ء میں کسی وقت ان سے یہ کہا تھا یعنی وقوعے کے دو مہینے بعد کہ لاہور جا کر دیکھیں کہ ٹریبونل میں کیا ہو رہا ہے۔ ریکارڈ پر ایسی کوئی بات نہیں جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اس تاریخ سے قبل اپیل کنندہ نے اس معاملے کی تحقیقات میں کسی طرح بھی دلچسپی لی ہو۔ یہ ایک مشہور واقعہ تھا جسے نومبر ۱۹۷۴ء سے بے حد تشہیر ملی تھی کہ احمد رضا قصوری نے ایف آئی آر میں اپیل کنندہ کا نام لکھوایا ہے اور یہ ایک لچر بات ہے کہ اس قدر تاخیر سے سعید احمد کو میدان میں اتارا جاتے

کیونکہ ٹریبونل کے روبرو وزیر اعظم کا نام لیا جا رہا تھا۔

(۴۹) مورخہ ۲۷ جنوری ۱۹۷۸ء کو ڈیفنس سیکرٹری کی طرف سے خط ملنے پر حیران رہ جانے کی جو کہانی سعید احمد نے گھڑی ہے وہ نہ صرف غلط بلکہ مضحکہ خیز ہے کیونکہ اس وقت سعید احمد اس حقیقت کا پوری طرح علم رکھتے تھے۔ ایمونیشن کی نوعیت کس نوعیت کا تھا اور اس حقیقت سے بھی کہ اس بور کا ایمونیشن ایف ایس ایف سمیت دوسری سول آرمڈ فورسز کے زیر استعمال تھا۔ نیز یہ بھی کہ کئی شہریوں کے پاس بھی قانونی اور غیر قانونی طور پر دستیاب تھا۔ سعید احمد کو یہ بھی معلوم تھا کہ مسٹر جسٹس شفیع الرحمن کا ٹریبونل بھی اس حقیقت سے باخبر تھا اس لیے اس کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ڈیفنس سیکرٹری کے خط کی اطلاع ٹریبونل کو دیتے لیکن میلو ڈرامائی طریقے پر انھوں نے یہ جھوٹی کہانی گھڑی ہے تاکہ اپنی وزیر اعظم سے ملاقات کے لیے جواز فراہم کر سکیں۔ اور یہ کہ اس ملاقات میں اپیل کنندہ نے انہیں ڈیفنس سیکرٹری کے خط کو ٹریبونل کے سامنے پیش کرنے سے مبینہ طور پر روک دیا۔

(۵۰) کہ سماعت کرنے والی بنچ کے یہ فیصلہ کرنے میں بھی غلطی کا ارتکاب کیا ہے کہ اپیل کنندہ نے مسٹر جسٹس شفیع الرحمن ٹریبونل کی رپورٹ کی اشاعت کو روک دیا کیونکہ وہ مخالفانہ تھی۔ سعید احمد جو خود اپنے اظہار راز استغاثے کے دوسرے گواہوں کے مطابق شریک کار تھا کی شہادت اس نکتے کے سلسلے میں بھی اتنی ہی بے وقعت ہے جتنی کہ کسی دوسرے نکتے پر۔

(۵۱) سماعت کرنے والی بنچ نے مقدمے کی سماعت انتہائی غیر منصفانہ مخالفانہ اور تنگدلانہ انداز میں کی۔ اس معزز عدالت کی توجہ گذشتہ موقعوں پر اس پہلو کی طرف منعطف کرائی جا چکی ہے۔ مقدمے کی سماعت کے دوران سماعت کرنے والی بنچ کے مختلف احکام اور اظہار رائے پر اعتراضات اٹھائے گئے۔ اور ان کے خلاف احتجاج کیا۔ لیکن یا تو انہیں نظر انداز کر دیا گیا یا مسترد اور بعض اوقات تو انہیں ضبط تحریر میں لائے بغیر ہی رد کر دیا گیا۔ اپیل کنندہ کی درخواست مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۷۷ء میں اس غیر قانونی بے قاعدہ اور جابرانہ انداز کی چند مثالیں بیان کی گئی تھیں جو مقدمے کی کارروائی کے دوران اختیار کیا گیا۔ ان درخواستوں کے احکام استرداد اور جس انداز میں انہیں مسترد کیا گیا وہ مقدمے کی کارروائی اور سماعت کرنے والی بنچ کے فیصلے کو کالعدم قرار دینے کے لیے کافی اسباب فراہم کرتے ہیں۔ سماعت کرنے والی بنچ اس بات کا تعین کرنے میں غلطی کا ارتکاب کیا کہ اپیل کنندہ نے مقدمے کی کارروائی شروع ہونے سے قبل اور کارروائی کے دوران تعصب اور عناد کے جو اسباب پیش کیے تھے وہ قطعیت اختیار کر چکے تھے۔ اپیل کنندہ اس اپیل میں، مسٹر جسٹس مشتاق حسین کی زیر صدارت سماعت کرنے والی بنچ کے تعصب اور عناد کے بارے میں پیش کیے گئے اسباب کو دہراتا ہے۔

مقدمے کی کارروائی کے منصفانہ ہونے سے متعلق درخواستوں اور خاص طور پر ۱۸ دسمبر ۱۹۷۷ء کی درخواست کو سرسری طور پر مسترد کرنے کے احکام سماعت کرنے والی بنچ اپیل کنندہ کے خلاف تعصب، عناد اور خصوصیت کو ثابت کرتے ہیں۔ باقی آئندہ

برّی امام کے عُرس کے موقع پر نعتیہ مشاعرہ

ضیا جالندھری نعت پڑھنے سے گریز کرتے رہے

محکمۂ اوقاف کا لاؤ لشکر اور لاہور کی ’ڈیرے داریاں‘

مارگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں خدا کے ایک برگزیدہ بندے کی آخری آرام گاہ ہے۔ ہر سال ۶ مئی سے گیارہ مئی تک ملک کے کونے کونے سے عقیدت مند روحانی غذا حاصل کرنے کے لئے یہاں آتے ہیں ان میں ہر طبقہ خیال کے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ خالص روح کے تعلق کو مستحکم کرنے اور تزکیہ نفس کا مقصد لے کر یہاں آتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو حضرت عبداللطیف شاہ بری امام کے مزار اور اس کے احاطے کو پانچ دن تک اس کے ذکر سے معمور رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد ہزاروں میں دہائیوں سے بڑھنے نہیں پاتی۔ آنے والے ہزاروں لوگ تھکے ہوئے ذہنوں کو آسودگی بہم پہنچانے کے لئے آتے ہیں۔ اور اس آسودگی کا سامان قدم، قدم گام، گام یہاں موجود پاتے ہیں۔ تھیٹر، موت کا کنواں، ناچ رنگ، سینما، مجرے۔ اس روحانی اجتماع کو خالصتاً ثقافتی میلے میں بدل دیتے ہیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھنے والا ذہن بہت واضح طور پر یہاں دو دنیا آباد دیکھتا ہے۔ ایک روح کی دنیا، جس کی حدود بری امام کے مزار تک ہے، اور دوسری دنیا جس کی حدود اسلام آباد سے بائیں ہاتھ مڑنے والی شاہراہ سے لے کر مارگلہ کی پہاڑی کے آخری کنارے تک پھیلی ہوئی ہے۔

یہ غالباً ۱۹۶۴ء کی بات ہے کہ مزاروں، دینی مدرسوں اور ایسی مساجد کو جن کے ساتھ صاحب ثروت لوگوں نے اپنی جائیدادیں وقف کی تھیں سرکاری تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اور ان دنوں مزارات کو سرکاری تحویل میں لینے کا عمل جن لوگوں کے ذہن میں تازہ ہے، ان کی نگاہوں سے وہ داستانیں اور اسکینڈلز پوشیدہ نہ ہوں گے۔ جو اس وقت منظرِ عام پر آئے تھے۔ جب مزارات تک اربابِ حکومت پہنچے۔ داتا دربار کے مجاوروں کا وہ دنیا دی کاروبار جو روحانیت کے پردے میں ایک گھناؤنا کھیل تھا اخبارات کی زینت بنا تھا۔ ایوب خان کا دور تھا۔ انہی دنوں یہ فیصلہ ہوا کہ اللہ کی سرزمین پر اللہ کے قانون کے نفاذ کی جدوجہد میں اپنی زندگیاں کھپا دینے والے بزرگوں کے مزارات پر ہونے والے عرس اس رقص و سرود اور اخراجات سے پاک ہونے چاہئیں۔ اور یہ بات بھی دنیا نے دیکھی کہ جب میلوں اور عرسوں میں رقص و سرود کی محفلوں پر پابندی لگی تو ہجوم سکڑنے لگے۔ پندرہ سال یہ میلے اور عرس ان خرافات سے پاک رہے۔ دو سال قبل اوقاف کا محکمہ فیڈرل حکومت کے حوالے کیا گیا۔ اور ان دو سالوں کے درمیان یہ خرافات ان روحانی محفلوں میں دوبارہ بڑی شد و مد کے ساتھ آگئی ہیں۔

بات حضرت عبداللطیف بری امام کے عرس سے شروع ہوئی تھی اس سال بھی یہ عرس چھ مئی سے ۱۱ مئی تک منایا گیا۔ اخباری زبان اور محکمہ اوقاف کے ترجمان کے مطابق یہ عرس بڑی ”عقیدت و احترام“ سے منایا گیا۔ اس ”عقیدت و احترام“، کی جھلک بھی دیکھ لیجئے کہ اس عرس میں پندرہ سال کے بعد پہلی بار لاہور سے پوری پندرہ ”ڈیرے داریاں“، اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ یہاں موجود تھیں اور پورا لنور پورا ایک ”کاریوال“ نظر آتا تھا۔ محکمہ اوقاف کے کرتا دھرتا بھی اپنے وجود کا جواز فراہم کرنے کے لئے ایک لشکر کے ساتھ یہاں موجود تھے۔ جس کی قیادت وزارت مذہبی امور و اوقاف ڈویژن کے جائنٹ سیکرٹری کر رہے تھے۔

ماہنامہ اوقاف کے ایڈیٹر فیضی صاحب نے فرمایا کہ محکمۂ اوقاف نے مزارات پر ہونے والے عرس کو بدعتوں اور خرافات سے پاک کر دیا۔ اور ان محفلوں کو بامقصد بنانے کے لئے بڑا کام کیا ہے عرس کے آخری روز جب مسٹر فیضی ایک نعتیہ مشاعرے میں یہ بیان دے رہے تھے تو محفل میں موجود لوگ لاؤڈ اسپیکر پر اونچی آواز میں بجنے والا یہ فلمی نغمہ بھی سن رہے تھے

”دو آ سینے نال لگ جا ٹھاہ کر کے“

محکمہ اوقاف کی جانب سے اس عرس کے موقع پر جن تقریبات کا اہتمام کیا گیا تھا ان میں یہ نعتیہ مشاعرہ پروگرام کی آخری کڑی تھا جس کی صدارت کے لئے ٹیلی ویژن کارپوریشن کے مینجنگ ڈائریکٹر ضیاء نثار احمد المعروف ضیاء جالندھری کو زحمت دی گئی۔

اس مشاعرے کی خاص بات ایک یہ تھی کہ اس میں محکمۂ اوقاف کے ملازم شعراء نے بھی حصہ لیا جن میں بشیر ناظم، ایڈیٹر ماہنامہ اوقاف فیضی اور ایڈیٹر ”رہ وطن“، جناب حبیب اللہ اوج کے نام شامل تھے۔ نہ صرف شامل تھے بلکہ نعت گوئی کا معاوضہ مبلغ ۱۰۰/- روپے بھی وصول کر رہے تھے۔ محفل کے اختتام کا اعلان کچھ اس طرح ہوا کہ ضیاء جالندھری جو امیر مشاعرہ بھی تھے۔ مائیک پر تشریف لائے اور نعت پڑھنے کی دعوت کے جواب میں محفل کو برخاست کرنے کا اعلان کر گئے۔ شعراء کی بڑی تعداد جن کی نظر میں مقام رسالت سے زیادہ ٹی وی کے پروگراموں پر تھیں۔ نہایت عجز سے جناب ضیاء جالندھری سے نعت کی فرمائش کر رہے تھے۔ اور ضیاء جالندھری بڑی نخوت سے فرما رہے تھے۔

CHAPTER 4

Reproduced below is a consolidated statement of budget and finance of the PCSIR for 1974-75.

The recurring and development grants of the Council of the year 1974-75 are as follows:

(i) Recurring ... ₨2, 54,76, 000
(ii). Development ... ₨ 15, 05, 000

Recurring grant;- The unitwise allocations and corresponding expenditure under establishment, local purchase and other expenditure are shown below.

Heads	Karachi Lab.	Lahore Lab.	Peshawar Lab.	FULREC	PSTC	Head Office, Karachi/ Islamabad	Solar Energy	Medical facili- ties for Karachi units	Central- ly admin. fund.	PL-480
1	2	3	4	5	6	7	8	9	10	11
Allocation	80, 14, 500	56, 82, 700	25, 40, 500	9, 84, 000	5, 90, 000	26, 20, 000	5, 00, 000	6, 00, 000	52, 00, 000	1, 14, 000
EXPENDITURE .										
Establish- ment	51, 70, 660	49, 58, 174	21, 77, 746	6, 62, 991	4, 47, 210	-				
Local purchase	3, 16, 300	4, 38, 104	2, 77, 192	1, 37, 007	-	-				
Other expenditure	10, 70, 360	4, 27, 621	3, 63, [illegible]	[illegible]	[illegible]	10, 02, 274				
Total expenditure	65, 57, 820	58, 23, 899	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]182	1, 25, 182	6, 38, 000	52, 00, 000	1, 14, 000

مجاھد بریلوی
کی رپورٹ

پی سی ایس آئی آر

۲۵ سال میں ۴۵ کروڑ روپے کی سرکاری امداد

نتیجہ = صفر

پاکستان کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ جو پی سی ایس آئی آر کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ پچیس سال قبل جن نیک مقاصد کے تحت وجود میں آیا تھا آج اُس کا نقش بھی نہیں ملتا۔ البتہ قومی سرمائے کی لوٹ پر دھاندلیوں، نوازشوں اور اقرباپروری کے جو مثالی کارہائے نمایاں پی سی۔ ایس آئی آر کے بڑوں نے انجام دیئے ہیں۔ اُس کی بازگشت برسوں سے سنائی دے رہی ہے مگر پی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ آر کے یہ بڑے لوٹ مار کا کچھ ایسا سائنٹیفک تجربہ رکھتے ہیں کہ متواتر شواہد کے باوجود اُن کا کچھ نہیں بگڑتا تھا۔ آج عظیم قومی اہمیت کا ادارہ تباہی کے دہانہ پر کھڑا ہے۔ مگر اس ادارے کے بڑے اسے سنبھالا دینے کی بجائے مزید کھوکھلا کر کے ڈھا دینے میں مصروف ہیں۔ پاکستان کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل

سائنسی تحقیقات کے ادارے نے کاغذی کام کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا

ریسرچ کی بنیاد ۱۹۵۳ء میں رکھی گئی تھی اور اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ سائنسی میدانوں میں دوسرے ملکوں کی اجارہ داری اور محتاجی کو ختم کیا جائے اور ملک کو سائنسی میدان میں خود کفالت کی راہ پہ گامزن کیا جائے اور ایسے تحقیقی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ جو ملکی وسائل ہی سے پورے ہو سکتے ہوں۔ یہ ایک خود مختار سا ادارہ تھا اور اُس کی منصوبہ بندی اور قیام میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے پہل کی تھی۔

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کی سربراہی میں جب اس ادارے نے کام شروع کیا تو اُس وقت کراچی میں تجربہ گاہ دو بیرکوں پر مشتمل تھی اور اس کے وسائل نہایت محدود تھے سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے سرکاری سرپرستی بھی حاصل نہیں تھی مگر ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کے دور میں محدود وسائل کے باوجود اس ادارے کی بنیادیں مستحکم ہونے لگیں۔ ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے اپنی کوششوں سے دوسرے ممالک سے کونسل کو مالی اور تکنیکی امداد دلوائی خاص طور پر یونیسکو ایشیا فاؤنڈیشن اور امریکہ کے ۴۸۰۔ پی ایل پروگرام سے مالی امداد حاصل کر کے نہ صرف یہ کہ کراچی، لاہور، پشاور ڈھاکہ اور چاٹگام میں تجربہ گاہیں قائم کی گئیں بلکہ قابل اور لائق سائنس دانوں کو جو ملک میں ناقدری کے سبب باہر جانے کے لئے پر تول رہے تھے۔ بہتر مشاہرے پر اس ادارے سے وابستہ کیا۔ اور انہیں مختلف سہولتیں بھی بہم پہنچائیں۔

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی ۱۹۶۶ء میں ریٹائر ہوئے تو یہ ادارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا تھا لیکن ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کے بعد یہ بدانتظامیوں اور بدعنوانیوں کا شکار ہو گیا۔

فروری ۱۹۷۳ء پی۔ سی۔ ایس آئی آر کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا جب حکومت نے قومی اہمیت کے پیش نظر اسے نئے انتظامات اور بھرپور وسائل کے ساتھ چلانے کا منصوبہ بنایا اس سلسلے میں قومی اسمبلی نے ایک بل پاس کیا جس کے تحت ایک نئی کونسل تشکیل دی گئی۔ جس میں وفاقی اور صوبائی حکومت کے نمائندے، پبلک اور پرائیویٹ انڈسٹریل سیکٹر سے تعلق رکھنے والے نمائندوں سمیت ۱۳ ارکان تھے پالیسی بنانے کا کام اسی کونسل کے سپرد تھا جب کہ ایک گورننگ باڈی بھی تشکیل دی گئی جو جنرل ایڈمنسٹریشن اور کونسل کے معاملات میں سپروژن کا اختیار رکھتی تھی

حکومت نے سالانہ ایک خطیر رقم کونسل کی ضروریات پوری کرنے کی منظوری بھی دی۔ ان تمام انتظامات اور کونسل کے ڈھانچے میں تبدیلی کے باوجود۔ پی۔ سی ایس آئی آر کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بلکہ کونسل میں نوازشات، غلط ترجیحات اور اقربا پروری کا جو سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ سرکاری سرپرستی میں آنے کے بعد یہ اور پروان چڑھا۔ سرکاری گرانٹ کا ملنا تھا کہ قابل اور اہل افراد کی تنزلی اور نااہلوں کی ترقیاں، تجربہ گاہوں میں آلات اور میٹریل کی خرید و فروخت میں دھاندلیاں ریسرچ پیپر کی تیاری اور منظوری میں جانبداری اور پھر سب سے بڑھ کر یہ غیر ترقیاتی فنڈ میں بے پناہ اضافے نے اس اہم قومی ادارے کو کھوکھلا کر دیا کچھ عرصے تک تو قومی جذبہ رکھنے والے سائنسدان اور محقق صبر و تحمل سے حالات کی تبدیلی ہونے کا انتظار کرتے رہے مگر جب یہ سلسلہ طویل اور ناقابل برداشت ہو گیا تو ایک ایک کر کے قابل سائنسدانوں نے اس ادارے کو چھوڑنا شروع کر دیا۔

ادارے میں اس کے چیئرمینوں کی تبدیلیوں نے بھی گہرے اثرات مرتب کئے اور ہر آنے والا جانے والے سے بڑھ کر ثابت ہوا۔ ڈاکٹر شفقت صدیقی ۱۹۷۴ء میں جب اس ادارے سے رخصت ہوئے تو وہ اس ادارے کو بڑے بُرے حال میں چھوڑ کر گئے تھے۔ ان کے بعد ڈاکٹر صلاح الدین نے چیئرمین کا عہدہ سنبھالا لیکن اچانک ان کا انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر صلاح الدین کے بعد ڈاکٹر عبدالغنی صدیقی نے چیئرمین کا عہدہ سنبھالا۔ چیئرمین کا عہدہ سنبھالنے سے قبل ڈاکٹر موصوف پبلک سروس کمیشن اور پاکستان اٹامک انرجی کمیشن میں بھی رہ چکے تھے۔ پی سی ایس۔ آئی آر میں وہ ممبر سائنس کی حیثیت سے آئے تھے اس وقت ان کا ہیڈ کوارٹر کراچی میں تھا کچھ ہی عرصے بعد انہوں نے کونسل میں چیئرمین کا عہدہ بھی سنبھال لیا مگر کونسل میں سائنس کی ممبری نہ چھوڑی اور آج بھی وہ بیک وقت چیئرمین اور ممبر سائنس کے عہدوں پر فائز ہیں۔

فروری ۱۹۷۳ء میں حکومت کی سرپرستی نئے انتظامات اور کونسل کے لئے ترقیاتی اخراجات میں اضافے کے بعد امید ہو چلی تھی کہ گورننگ باڈی اور اعلیٰ اختیاراتی کونسل کی موجودگی میں پی سی ایس آئی آر کے معاملات بتدریج درست ہونا شروع ہو جائیں گے۔ مگر پی سی ایس آئی آر کی سالانہ رپورٹوں سے ترقیاتی و غیر ترقیاتی کاموں میں بے پناہ اخراجات کے مقابلے میں جو کارکردگی ریکارڈ میں بتائی گئی ہے وہ قابل افسوس ہی نہیں قابل گرفت بھی ہے۔ درج ذیل سالانہ ترقیاتی و غیر ترقیاتی اخراجات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پچھلے پانچ سال میں پی سی ایس آئی آر کے "کرتا دھرتا" کس بڑے پیمانے میں قومی سرمائے کو غیر ترقیاتی اخراجات کے نام پر لٹاتے رہے ہے۔

سال	ترقیاتی مصارف	غیر ترقیاتی مصارف
۱۹۷۲-۷۳	۱۵ لاکھ ۹۴ ہزار	۱ کروڑ ۷۶ لاکھ ۳۷ ہزار ۴ سو
۱۹۷۳-۷۴	۲۳ لاکھ ۹۴ ہزار	۲ کروڑ ۱۴ لاکھ ۴۰ ہزار
۱۹۷۴-۷۵	۱۷ لاکھ ۵۵ ہزار	۲ کروڑ ۴۵ لاکھ ۴۰ ہزار
۱۹۷۵-۷۶	۳۸ لاکھ ۲۰ ہزار	۲ کروڑ ۷۵ لاکھ ۵۰ ہزار
۱۹۷۶-۷۷	۸۰ لاکھ	۲ کروڑ ۹۳ لاکھ ۲۰ ہزار
۱۹۷۷-۷۸	۱ کروڑ ۱۴ لاکھ ۷۰ ہزار	۳ کروڑ ۲۳ لاکھ ۲۸ ہزار

اس طرح سرکاری سرپرستی میں آنے کے بعد پی سی ایس آئی آر نے ترقیاتی کاموں پر کل بجٹ میں سے ۲ کروڑ اکیانوے لاکھ چوراسی ہزار خرچ کئے جب کہ غیر ترقیاتی مصارف میں بارہ کروڑ ۹۳ لاکھ ۳۱ ہزار خرچ ہوئے۔ کسی بھی تحقیقی اور قومی اہمیت کے ادارے

پی سی ایس آئی آر کے سربراہ کی کار کے پٹرول کا خرچ ، ۲ لاکھ

میں ترقیاتی اور غیر ترقیاتی مصارف میں اخراجات کے اس تناسب کی مثال مشکل سے ملے گی۔

یہ غیر ترقیاتی اخراجات جسے پی سی ایس آئی آر کے "بڑے" اہم ادارے کو مستحکم کرنے کے لئے نہایت ضروری بتاتے ہیں وہ جو ہیں چیئرمین، ممبر ٹیکنالوجی ممبر فنانس اور ان کے من پسند عملے کے بھاری مشاہرے، ٹی اے، ڈی اے اور دیگر عیاشانہ ٹھاٹ باٹ پر خرچ ہوتے ہیں۔ ان کی بعض تفصیلات جو ذیل میں درج ہیں بڑی دلچسپ ہیں۔

۱۔ چیئرمین صاحب نے کراچی کے ساحل پر کہکشاں میں ایک بنگلہ دو ہزار روپے ماہوار کرائے پر لیا۔ اس بنگلہ کا ایڈوانس ۳۶،۰۰۰ روپے ادا کیا گیا۔ جب کہ چیئرمین صاحب صرف ۱۵ سو روپے تک کے مکان رکھنے کا حق رکھتے ہیں۔ پانچ سو روپے زائد ماہوار کا نقصان پہنچانے کے علاوہ پچاس ہزار روپے علیحدہ ہیں جو مکان کی سجاوٹ اور آرائش پر برباد کئے گئے۔

۲۔ ایک اسٹینو گرافر کو پبلک سروس کمیشن سے چیئرمین صاحب کونسل میں ساتھ لے کر آئے پہلے انہیں گریڈ ۱۶ دیا گیا پھر گریڈ ۱۷ دیا گیا۔ اس پر ۱۵۰ روپے کی اسپیشل تنخواہ مزید دی گئی۔ جب کہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس اسٹینو گرافر کا کسی سلیکشن بورڈ سے تقرر نہیں ہوا۔

۳۔ دفتر کا ایک ڈرائیور اور دو چپراسی مستقل چیئرمین کے مکان میں ذاتی ملازم کی حیثیت سے تعینات رہتے ہیں۔

۴۔ گزشتہ دو سال کی مدت میں پانچ لاکھ کے صرفے سے پانچ گاڑیاں خریدی گئیں جس میں سے دو پرائیوٹ پارٹیوں سے اونے پونے داموں خریدی گئیں۔ مگر ریکارڈ میں ہر گاڑی ایک لاکھ روپے کی خریدی بتائی گئی۔ یہ الگ موضوع ہے کہ پانچ نئی گاڑیوں کی اس عرصے میں اس ادارے کو ایسی کون سی ضرورت پڑ گئی صرف ایک سال میں ادارے کے سربراہ نے غیر ترقیاتی اخراجات کے کھاتے میں اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے جو مصارف کئے ان کی تفصیلات یہ ہیں۔

ٹی اے ۔ ۱ لاکھ ۲۳ ہزار انٹرٹینمنٹ ۲۹ ہزار
ٹیلیفون بل ۱ لاکھ ۱۳ ہزار اسٹاف کار پٹرول ۱ لاکھ ۹۶ ہزار
مجموعی رقم ۴ لاکھ ۶۱ ہزار روپے۔

ایک طرف تو چیئرمین، سیکریٹری، ممبر فنانس اور ٹیکنالوجی کے یہ ٹھاٹ بھاٹ ہیں دوسری جانب تجربہ گاہیں ضروری ساز و سامان اور کیمیکل نہ ہونے کے سبب تحقیقی کاموں کے لئے عملی تجربات کی ضروریات سے محروم ہیں۔

کونسل اپنی سب میں بڑی کارگزاری ریسرچ پیپر کی تیاری بتاتی ہے۔ چونکہ تحقیق کام کرنے والے سائنسدانوں کی ترقی کا سارا دارومدار اعلیٰ افسران کی خوشی و ناخوشی پہ ہے یا پھر پیٹینٹ اور ریسرچ پیپر کی اشاعت پر ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سائنسدان تحقیقی کاموں پر اپنا زیادہ وقت دینے کے بجائے ریسرچ پیپر کی تیاری کے کاغذی کام کو دیتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۷۵-۱۹۷۴ء کے دوران کیمیکل اسٹنڈرڈ ڈویژن میں اگرچہ کوئی کام انجام نہیں پایا لیکن ۱۲ ریسرچ پیپر چھپے تھے۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۸ء تک یعنی کونسل کے پچیس سال میں کل ۲۲۴ پروجیکٹ مکمل ہوئے اس طرح مکمل ہونے والے منصوبوں کا سالانہ اوسط ۹٫۲ ہے۔ کونسل کی نااہلی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا ایک ہی ریسرچ جرنل ہے جس میں تحقیقاتی پرچے شائع ہوتے ہیں لیکن یہ ہر سال دو سال کی تاخیر سے تیار ہوتا ہے۔

ایک افسوسناک امر یہ بھی ہے کہ اکثر شعبے محض بعض افراد کی تقرری کے لئے وجود میں آتے ہیں۔ مثلاً اس کی ایک مثال شمسی توانائی SOLAR ENERGY کا شعبہ ہے جو محض ایک "ڈاکٹر" کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۰ء کے دوران اس شعبے کے لئے ۱۳ لاکھ روپے مختص کئے گئے لیکن اس محکمہ کے سربراہ کی شان بے اعتنائی ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے اس دوران صرف ساڑھے تین لاکھ روپے خرچ کئے بقیہ دس لاکھ اس لئے خرچ نہ کئے جاسکے کہ اس کو کام میں لانے کے لئے ایسے "آلات" ہی موجود نہیں ہیں۔

پی سی ایس آئی آر کا ایک اردو سائنس معلوماتی رسالہ "کاروان سائنس" اور ایک انگریزی رسالہ "سائنس کرانیکل" ہر ماہ نکلتا تھا جو گزشتہ ڈیڑھ سال سے بند ہے۔ پھر سب سے قابل غور بات یہ ہے کہ پچھلے دو سالوں سے کونسل کی کوئی سالانہ رپورٹ منظر عام پر نہیں آئی ہے جس سے ادارے کی کارکردگی کا اندازہ لگایا جاسکے یا جس میں سالانہ کئے گئے اخراجات کو ریکارڈ پر لایا گیا ہو۔

پی سی ایس آئی آر اپنے قیام کے پچیس سالوں میں اب تک تقریباً ۵۴ کروڑ روپے کی امداد حکومت سے "گرانٹ" کے نام پر وصول کر چکا ہے۔ مگر اس ادارے نے جو ملک کو سائنسی میدان میں خود کفالت کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا اب تک کیا کچھ کیا ہے اس سے پاکستان کے عام شہری تو ناواقف ہیں ہی مگر خود پی سی ایس آئی آر کے بڑے بھی یہ بتانے کی پوزیشن میں نہیں کہ سوائے ریسرچ پیپر کی تیاریوں اور مختلف پروجیکٹ کو کاغذوں میں بکھیرنے کے علاوہ انہوں نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔

پشتون اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا جلسہ

پشتون اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن نے محنت کشوں کے تعاون سے تمام پشتون علاقوں میں مزدوروں کی فتح کے عالمی دن یکم مئی منانے کے لئے اجتماعات کئے کوئٹہ میں مقامی تنظیم کے زیر اہتمام ایک اجتماع ہوا جس سے خطاب کرتے ہوئے آرگنائزیشن کے مرکزی نائب صدر رضا محمد رضا نے کہا کہ شکاگو کے مزدوروں نے خون بہا کر عالمی مزدور تحریک کی جو بنیاد رکھی ہے اسی کو مشعل راہ بنا کر پاکستان کے محنت کش عوام بھی ایک خوشحال معاشرہ کے قیام کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے اجتماع سے مزدور رہنما لال محمد نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پشتون محنت کشوں کا ایک اہم اور فوری مسئلہ ملک میں پشتون علاقوں پر مشتمل صوبہ پشتونستان کا قیام ہے اور ملک بھر کے محنت کشوں کو چاہیئے کہ وہ اس بنیادی مسئلے پر ان کا ساتھ دیں۔ جلسے کے آخر میں ایک قرارداد میں یکم مئی کے شہیدوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ملک بھر کے محنت کش عوام سے اپنی یکجہتی کا اظہار کیا گیا۔

پاکستان اسٹیل ملز کراچی

ان دنوں پاکستان اسٹیل ملز کے حالات ایسے ہیں کہ اگر ان کی طرف فوری توجہ نہ دی گئی تو حالات اور بھی دگر گوں ہو جائیں گے اور ملک کی معیشت پر ایک اور کاری ضرب پڑے گی۔

ہمارے خیال میں پہلا اقدام یہ ہونا چاہیئے کہ موجودہ انتظامی بورڈ کی جگہ فی الفور ایک ایسا بورڈ قائم کیا جائے جو واقعی دیانت دار، ترقی پسند، اور باصلاحیت افراد پر مشتمل ہو۔ دوسرا اقدام یہ ہونا چاہیئے کہ سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ کے کسی جج کی سربراہی میں ایک اعلیٰ سطحی کمیشن مقرر کیا جائے جو اس مل میں ہونے والی بدعنوانیوں کی تحقیقات اور ضروری سفارشات کرے اس پراجیکٹ میں بکثرت ایسے عناصر بھرے پڑے ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ پیپلز پارٹی سے تعلق رکھتے۔ خود پراجیکٹ ڈائرکٹر بھی پی پی پی کا آدمی ہے۔ جسے مسٹر رفیع رضا اور ٹکا خاں کی سفارش پر مسٹر بھٹو نے اس عہدے پر فائز کیا تھا۔ ان عناصر نے نہایت ہی ہوشیاری سے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ایک دورے کا اہتمام کر کے ان کی زبان سے اپنے لئے کچھ تعریفی ریمارکس کرا لئے حالانکہ اس منصوبے سے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے لئے کم از کم دو تین ماہ تک گہری نظر سے اس کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ ہمارا مشورہ ہے کہ مارشل لاء کے حکام اپنے آپ کو اس پراجیکٹ سے اس وقت تک وابستہ نہ کریں جب تک کہ ایک غیر جانبدار کمیشن کے ذریعہ اس کا سارا کچا چٹھا سامنے نہ آ جائے

عبدالرحمان۔ صدر پاکستان اسٹیل ملز
آفیسرز ایسوسی ایشن۔ کراچی

پنجاب پڑھیا کا جلسہ

پنجاب پڑھیا لاہور کے زیر اہتمام ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں مزدوروں، طلباء اور دیگر دانشور حضرات نے شرکت کی اجلاس سے پنجاب پڑھیا کے صدر جناب احمد دارثی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب بھی کبھی ظالم نے مظلوم کو دبانے کے لئے اس کے جائز حقوق کو سلب کرنے کے لئے گولی کا سہارا لیا ہے تو ہمیشہ مظلوم طبقات کی فتح ہوئی۔ آج سے سو سال قبل شکاگو کے مزدوروں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج شکاگو کے مزدوروں کی سوچ آئندہ کے مزدوروں کے لئے لائحہ عمل بن گئی۔ آج کا مزدور بھی سرمایہ دار طبقات کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے۔ سامراجی قوتیں جتنا مزدوروں کے حقوق چھین لینا چاہتی ہیں اتنا ہی ردِ عمل شدید ہے سامراجی قوتوں کے خلاف مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں

ویت نام کمبوڈیا، کیوبا اور دیگر ممالک میں محنت کش عوام کا راج قائم ہوا۔ انہوں نے انسان کو بحیثیت انسان مانا ہے یہی وجہ ہے کہ دیگر ایشائی اور افریقی ممالک میں ایسی ہی جدوجہد جاری ہے۔ ماضی کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں ہماری جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک سامراج اور اس کے گماشتے اپنے ناپاک عزائم میں منہ کی نہ کھا لیں۔

فیڈریشن آف پنجاب سٹوڈنٹس کے صدر سلیم شاکر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دنیا بھر کے طلباء اور نوجوان امن سلامتی اور سامراج دشمنی کی جدوجہد میں مظلوم عوام کے ساتھ ہیں۔ انہوں نے ملتان کے شہیدوں پٹ فیڈر ہشتنگر کے شہید کسانوں اور ملہ کے محنت کش عوام کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج ان محنت کشوں کی قربانیاں اس امر کا ثبوت ہے کہ شکاگو کے شہید مزدوروں کی جدوجہد ہی دراصل ان کی منزل ہے۔

ورکرز فیڈریشن کے مزدور رہنما شبیر چغتائی نے بھی اجلاس سے خطاب کیا۔ انہوں نے کہا کہ کوٹ لکھپت جیل (لاہور) کراچی حیدر آباد اور دیگر صنعتی شہروں میں مزدوروں کی گرفتاریاں اس چیز کی گواہی ہیں کہ شکاگو کے مزدوروں کا خون رائیگاں نہیں گیا۔

آخر میں چند قراردادیں پیش کی گئیں جو اتفاق رائے سے منظور کر لی گئیں۔

انصاف اور غیر جانبداری

آج ملک میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد ہے مارشل لاء کے حکم کے مطابق صرف جلسے جلوس پر ہی نہیں بلکہ ہر ایسی بات پر پابندی ہے جس سے کسی سیاسی جماعت یا سیاسی فرد کو سیاسی طور پر فائدہ پہنچانا مقصود نہ تو زبانی طور پر کی جا سکتی ہیں نہ تحریری طور پر۔ لیکن عملاً جب ہم دیکھتے ہیں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ پابندی صرف پیپلز پارٹی کے لئے ہے

(ابرار حسین ڈار۔ اسلام آباد)

T.V. پروڈیوسر

پاکستان کی جیلوں میں آرے چلا رہے ہیں

ٹیلیویژن کے قیدی

ایک واقفِ حال کے قلم سے

پاکستان کے موثر ترین ذریعۂ ابلاغ ٹیلی ویژن کے کارکن گذشتہ چار ماہ سے پابند سلاسل ہیں۔ پروڈیوسر۔ نیوز پروڈیوسر کیمرہ مین۔ انجینیر، تکنیک کار اور دوسرے اہم شعبوں سے تعلق رکھنے والے ۲۵۔ تخلیقی کارکن ملک کے مختلف جیلوں میں بامشقت قید کاٹ رہے ہیں۔ سو کے لگ بھگ معطلیوں اور برطرفیوں کا شکار ہو چکے ہیں۔ اور جو باقی بچ گئے ہیں وہ ٹیلی ویژن سنٹر کی خاردار دیواروں اور مسلح سپاہیوں کے پہرے میں جیل سے بھی بدتر قید کی زندگی گذار رہے ہیں۔ دنیا بھر میں ٹیلی ویژن کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا اچھوتا اور پہلا موقع ہے۔

گرفتار، برطرف یا معطل ہونے والوں میں ٹیلی ویژن کے ممتاز اور قابل پروفیشنل اور تکنیک کار بھی ہیں۔ معروف ادیب، شاعر اور دانشور بھی اس ادارے کے تجرباتی قیام سے لیکر آج تک اس کی بنیادوں کو اپنے خون سے سینچنے والے کارکن اور مزدور بھی وہ بھی جنہوں نے ۱۹۶۴ء میں ریڈیو پاکستان لاہور کے عقب میں ایک کٹیا نما اسٹوڈیو میں کنڈم مشینوں سے باقاعدہ اور کامیاب نشریات شروع کر کے غیر ملکی ماہرین کو حیرت زدہ کر دیا تھا اور وہ بھی جنہوں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں دن رات اپنی زندگیوں کو خطرے میں ڈال کر اپنے گھر بار کو بھلا کر۔ نشریات جاری رکھیں اور گھر گھر۔ کرفیو کے دنوں میں امید، حوصلے، جوش اور تفریح کے سامان کئے اور وہ بھی جنہوں نے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شاندار خدمات انجام دیں محاذوں پر جا کر فلمیں بنائیں۔ حوصلہ شکن حالات میں حوصلہ افزا۔ پروگرام پیش کئے۔ نفسیاتی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی طور پر شکست سے دوچار قوم کو تعمیرِ نو، مزاحمت ایمان اور اُمید کا پیغام دیا۔ اور وہ بھی جنہوں نے ملک کی ثقافتی ادبی اور سماجی یک جہتی کے لئے چند برسوں میں وہ خدمات سرانجام دیں۔ جو دوسرے ذرائع برسہا برس میں بھی نہیں دے سکتے تھے اور وہ بھی جنہوں نے اسلامی سربراہ کانفرنس کے دوران ایک قومی اور ایمانی جوش و جذبہ کے ساتھ اس تاریخ ساز واقعہ کی نشریات دنیا بھر میں محیر العقول کامیابی تک پہنچائیں اور دنیا بھر کے اداروں سے خراج تحسین حاصل کیا۔ اور وہ بھی جنہوں نے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء کے قومی انتخابات میں بے مثال کارکردگی کا مظاہرہ

یونینیں توڑ دی گئیں ○ آواز دبادی گئی ○ اور پروگرام بے اثر ہو گئے

کیا۔ اور طویل ترین نشریات کے ریکارڈ قائم کیئے۔

ان میں سے چھ میانوالی جیل میں بھیج دیئے گئے ہیں چھ ڈیرہ اسماعیل خان جیل میں چار راولپنڈی اور پانچ کوئٹہ کی جیلوں میں۔ میانوالی جیل میں لاہور ٹیلی ویژن والے ہیں۔ عنایت شاہ (کیمرہ مین) آصف شیخ (نیوز پروڈیوسر) شاہد محمود ندیم (پروڈیوسر پروگرام) حبیب گل وشوکت حیات (ایڈمنسٹریشن) اور محمد عالم (مکینک)۔ بچاس سنٹی گریڈ کے درجہ حرارت میں وہ آرے چلا رہے ہیں۔ رندے آریاں آزما رہے ہیں۔ پالش کر رہے ہیں۔ کرسیاں بُن رہے ہیں۔ کڑی دھوپ میں سامان لاتے لے جاتے ہیں، چرخے چلاتے ہیں، بان بٹتے ہیں۔ کمبل سی رہے ہیں ان کو سی کلاس دی گئی ہے اور اخلاقی قیدیوں کے ساتھ بارکوں میں رکھا گیا ہے کسی قسم کی سہولت نہیں دی گئی حتیٰ کہ علاج معالجے کی بھی نہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں پشاور ٹیلی ویژن کے کارکن بند ہیں۔ ان میں مبارک شاہ (ڈی ایم او) اعجاز نیازی (پروڈیوسر) اظہر مسعود (ٹرانسمیشن کنٹرولر) عتیق احمد (پروڈیوسر) اور توفیق شاہ شامل ہیں۔ انہیں پشاور سے ڈیرہ اسماعیل خان بھیجا گیا ہے اور شدید گرمی میں پابندی سے مشقتیں لی جارہی ہیں۔ سی کلاس قیدی شمار ہوتے ہیں وہ عادی مجرموں کے ساتھ رکھے گئے ہیں۔ پنڈی والے ظہیر جاوید (نیوز پروڈیوسر) راجہ محمد حسین (پلاننگ آفیسر) اورنگ زیب (کیمرہ مین) اور رشید بلا (ڈرائیور) ان دنوں بھٹو صاحب کے اسی جیل میں ہونے کی وجہ سے غیر معمولی پابندیوں کا شکار ہیں۔ کرسیاں بُنتے ہیں۔ قالین سازی کرتے ہیں اور بان بٹتے ہیں کوئٹہ میں غلام محمد شیخ (لائبریرین) امجد بخاری (کیمرہ مین) عباس (کیمرہ مین) اور (پروڈیوسر) قید ہیں اور مشقت کے مزے چکھ رہے ہیں۔

برطرف اور معطل ہونے والوں میں مشہور ڈرامہ نگار اور شاعر، سرمد صہبائی بھی ہیں۔ جو لاہور کے سکرپٹس ایڈیٹر تھے۔ پروگرام پروڈیوسر اور پنجابی کے ممتاز شاعر مشتاق صوفی بھی۔ پروڈیوسر۔ شاعر سلیم طاہر، نیوز پروڈیوسر اور پرانے صحافی بابر زمان بھی۔ تجربہ کار کیمرہ مین اسماعیل تاج، سینئر میک آپ آرٹسٹ نسیم صدیقی، مشہور خطاط ظہور ناظم، پروڈیوسر اور آرٹسٹ طاہر رضوی بھی پشاور کے ہونہار پروڈیوسر طارق سعید، کراچی کے ممتاز نیوز پروڈیوسر طارق فتح، کوئٹہ کے ڈیزائنر حفیظ ڈار۔ بھی شامل ہیں ۱۹۷۱ء میں قومی خدمات انجام دیتے ہوئے بھارتی جنگی کیمپوں میں صعوبتیں برداشت کرنے والے پروگرام پروڈیوسر مرغوب الرحمان کو بھی معطلی کے اعزاز سے نوازا گیا ہے ان لوگوں کے خلاف تحقیقات ہو رہی ہیں اور تحقیقاتی افسر سابق صوبائی وزیر صاحب داد کے بیٹے اختر داد کو مقرر کیا گیا ہے۔ جو گذشتہ پانچ برسوں میں ایک معمولی انجینئر سے کنٹرولر کے مقام تک جا پہنچے ہیں ان کے داخلے ٹی وی حدود میں بند کئے گئے ہیں اور ان پر انتہائی مضحکہ خیز (پانچ پانچ سال پرانے کیس بنا کر) الزامات عائد کئے گئے ہیں۔

ایک خصوصی حکم کے ذریعے پاکستان ٹیلی ویژن کی تمام یونینوں کو بین کر دیا گیا ہے اور ان دنوں ہر قسم کی ٹریڈ یونین سرگرمی یا اجتماعی کارروائی کی سختی سے ممانعت ہے پابند سلاسل ساتھیوں کی مدد کرنے، انہیں ملنے یا خط لکھنے کی کم از کم سزا چارج شیٹ اور معطلی ہے۔

ٹیلی ویژن سنٹر میں ان دنوں بیگار کیمپوں یا جنگی قیدیوں کے کیمپوں کا ماحول ہے۔ دہشت، خوف و ہراس بے یقینی اور آہنی ڈسپلن کی دیواروں کے اندر سپاہیوں، سیکورٹی افسروں، چوکیداروں، افسروں کے پالتو کتوں اور سنگینوں سے فن کاروں، دانشوروں، انجینئروں اور تخلیق کاروں سے کام لیا جا رہا ہے یہ غرض نہیں کہ کام کیسا ہے۔ بس کام ہوتے نظر آنا چاہیئے۔ یہ فکر نہیں کہ اندر کمروں میں بیٹھ کر کارکن کیا کرتے ہیں مگر وہ سیٹوں سے جڑے نظر آنے چاہئیں۔ یہ پرواہ نہیں کہ پروگرام تخلیق ہونے کے لئے ساز گار اور خوشگوار ماحول ہے یا نہیں۔ بس قواعد وضوابط کی پابندی ہونی چاہیئے۔ جنرل منیجر اپنے کتوں کے ساتھ دورہ کرے تو ہر طرف قبرستان کا سناٹا ہونا چاہیئے ہر چہرے پر خوف بے یقینی اور فرمانبرداری تحریر ہونا چاہیئے وقت پر دفتر اور وقت پر کھانے کے لئے باہر نکلنا چاہیئے چنانچہ اب حال یہ ہے کہ پروڈیوسر ڈرے ڈرے سہمے سہمے کمروں میں دبکے بیٹھے ہیں انجینئر نت نئے تجربے کرنے، دن رات محنت کرنے کی بجائے ڈیوٹی کے اوقات میں مشینوں کی طرح کام کرتے نظر آتے ہیں ایڈیٹر کیمرہ مین، ڈیزائنر میک اَپ والے فلم سیکشن والے۔ سب ڈیوٹی پر آتے ہیں۔ اور چلے جاتے ہیں فن کار موسیقار، گلوکار، کئی کئی گھنٹوں کی ذلت کے بعد اگر ٹی وی سنٹر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو سیکورٹی، پروگرام منیجر، جنرل منیجر، ڈسپلن اور طرح طرح کے خوف ان کے اندر کے آرٹسٹ کو مفلوج کر دیتے ہیں جہاں، آزاد، فکر انگیز اور خیال افروز تخلیقی فضا ہوتی تھی۔ وہاں تنگ نظری کلرک ذہنیت اور منیجر رویے پروان چڑھ رہے ہیں۔ جہاں نت نئے تجربے ہوتے تھے۔ وہاں اب روٹین اور آفس آرڈر تخلیق ہو رہے ہیں جہاں قوم کی تعلیم اور تفریح کے منصوبے بنتے تھے وہاں بھسے اور پھیلے پٹے ہوئے پروگرام ناظرین کو بور اور بے زار کرنے کا سبب بنے ہیں اُدھر ہیڈ کوارٹرز اور کنٹرولر روز انتقامی کارروائیوں کے لئے نئے منصوبے بناتے ہیں۔ ہر روز معطل برطرف ہونے والوں کی نئی فہرست بنتی ہے اور حکومت کو تازہ ترین انتشار پسندوں اور یونینیوں کے نام اور رپورٹیں بھیجی جاتی ہیں۔

اس بیگار کیمپ سے حکام کیا مقصد حاصل کر رہے ہیں۔ اس سوال کا جواب تو ارباب اختیار ہی دے سکتے ہیں۔ البتہ حکومت کو ٹیکس اور ٹی وی کارپوریشن کو ہر دو گنی ہوتی ہوئی لائسنس فیس دینے والے ناظرین یہ ضرور پوچھ سکتے ہیں کہ کروڑوں روپے کے سرمائے سے چلنے والا یہ اہم ترین ذریعہ ابلاغ یہ انتہائی موثر قومی ادارہ آخر اس طرح کیوں تباہ کیا جا رہا ہے جس ادارے سے عوام کے شعور کو بڑھانے، یکجہتی کو فروغ دینے، تعلیم و تفریح اور پروپیگنڈے

کا بہترین کام لیا جاسکتا ہے۔ اسے کیوں بے رنگ، بے مزہ غیر دلکش اور بیزار کن بنایا جارہا ہے۔ کیا دنیا کے کسی بھی ملک میں ٹیلی وژن کے پروفیشنلز، تکنیکی ماہرین اور فن کاروں سے ایسا سلوک ہوتا ہے۔ کیا کہیں ایسے حالات میں سنگینوں کے سائے میں، کبھی بھی تخلیق ممکن ہوسکتی ہے۔

ٹیلی وژن پروڈیوسروں، نیوز پروڈیوسروں، کیمرہ مینوں، انجینروں کو کوڑوں بامشقت قید اور سی کلاس دے کر، وسیع پیمانے پر برطرفیاں کرکے اور کارکنوں کو خوف زدہ کرکے، یونین توڑ کر ممکن ہے مفادات رکھنے والے ایک مخصوص ٹولے کو خوش کرلیں۔ مگر دنیا بھر میں پاکستان اور ٹیلی وژن کارپوریشن کی جو جگ ہنسائی ہوئی ہے اس کی مثال نہیں ملتی ایمنسٹی انٹرنیشنل کی سالانہ رپورٹ اور مختلف ممالک کے ٹی وی۔ ریڈیو کے نیٹ ورکوں کے ردعمل سے یہ واضح ہوجاتا ہے۔ کہ ان اقدامات کا سنجیدگی سے نوٹس لیا گیا ہے۔ ملک کے اندر دانشوروں، صحافیوں، مزدوروں، فن کاروں اور سیاست نے ان اقدامات پر احتجاج کیا ہے۔ ٹیلی وژن کے کارکن جو اس وقت دہشت گردی خوف و ہراس، پیچیدہ حالات اور کڑے ضابطوں کی وجہ سے مہر بہ لب ہیں، ہمیشہ تو چپ نہیں رہ سکیں گے۔ اور اگر ان کے ہونٹوں پر تالے لگا دیے گئے ہیں، تو دلوں سے نفرت اور احتجاج کو نکالا تو نہیں جاسکتا۔

اب یہ فیصلہ حکومت کو کرنا ہے، نئے سیکرٹری اطلاعات کو فیصلہ کرنا ہے کہ انہیں کون سی صورت قبول ہے۔ بظاہر مجبوراً فرمانبردار اور چپ چاپ مشینی آدمیوں سے کام لینا ہے۔ جن کے دلوں میں غم و غصہ، احتجاج اور بے چینی ہو یا وسیع القلبی، سوجھ بوجھ اور سیاسی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے ٹیلی وژن کارکنوں کے حقیقی نمائندوں کے ساتھ تفصیلی مذاکرات کرکے ایک دیرپا اور قابل قبول سمجھوتہ کرکے — رضاکارانہ اور تخلیقی خدمات کرنے والے پیشہ ور ماہرین اور فن کاروں سے شاندار خدمات حاصل کرنا — جس میں قوم کا بھی مفاد ہے۔ کارپوریشن کا بھی اور کارکنوں کا بھی۔

مگر شاید جو مفاد پرست، بانجھ اور ملک دشمن عناصر ان دنوں متعلقہ حکام کو سرگرمی سے مشورے اور تجاویز دے رہے ہیں۔ اور اپنے مزموم مقاصد پورے کر رہے ہیں۔ وہ ایسے کسی آبرومندانہ سمجھوتے کی راہ میں روڑے اٹکانے کی سرتوڑ کوشش کریں گے اور ممکن ہے اس میں کامیاب بھی ہوجائیں۔ مگر پھر بھی آج نہیں تو کبھی نہ کبھی حکومت اور ٹی وی کارکنوں کے درمیان ایک ڈائیلاگ اور افہام و تفہیم ہونا ہی ہے۔ یہ اور بات ہے، تب تک اس ادارے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ چکا ہو۔

میانوالی جیل کے اسیر

عنایت شاہ (نیوز کیمرہ مین)

فلم لائن کا وسیع تجربہ۔ ٹیلی وژن کے سنٹرل فلم پروڈکشن یونٹ سے وابستہ ہوتے۔ "لال قلعے سے لالو کھیت تک"، فلم متعدد دستاویزی اور معلوماتی فلموں کی عکاسی کی۔ ۷۱ء کی جنگ میں خدمات پر فوج کی طرف سے تعریفی سند دی گئی۔ چھمب جوڑیاں اور سلیمانکی سیکٹروں میں جنگ کی فلم کوریج کی ۱۹۷۳ء کے سیلابوں کی فلم رپورٹنگ میں شہرت حاصل کی۔ اسلامی کانفرنس کے دوران ایئرپورٹ اسمبلی چیمبرز، بادشاہی مسجد میں فلم رپورٹنگ کی وزیر اعظم صدر اور غیر ملکی سربراہوں کے دوروں کی عکاسی کرتے رہے ہیں۔ ٹی وی حکام کی طرف سے متعدد سندیں اور تعریفی سند حاصل کی ہے۔ لاہور یونین کے صدر اور تمام یونینوں کی مشترکہ الیکشن کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔ چنانچہ آج کل میانوالی سنٹرل جیل میں ان سے بڑھئی کا کام لیا جارہا ہے خاص طور پر آرا چلاتے ہیں۔

آصف شیخ (نیوز پروڈیوسر)

لاہور ٹیلی وژن سے خبرنامہ نشر کرتے تھے قائم مقام نیوز ایڈیٹر کی خدمات بھی انجام دیں۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں جان ہتھیلی پر رکھ کر رپورٹنگ کی خبریں نشر کیں سیلابوں اور آفات کے دوران اہم خدمات سرانجام دیتے رہے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں بہترین کوریج کی۔ اسلامی کانفرنس کے دوران میں دنیا بھر کو بلیٹن فیڈ کئے ملک کے سربراہوں کے دوروں کی کوریج کے ماہر شمار ہوتے رہے۔ غیر ملکی معززین کی پریس کانفرنسوں کو کور کرتے کھیلوں کی کوریج کے لئے مشہور تھے اسمبلی سیشن اور ہائی کورٹ کور کرتے رہے بے شمار فلم رپورٹیں فیچر وغیرہ تیار کئے۔ دور دراز مقامات کے دورے کئے ۱۹۶۴ء سے ٹیلی وژن کارپوریشن کی خدمت سرانجام دے رہے تھے متعدد تعریفی خطوط اور سرٹیفکیٹ حاصل کر چکے ہیں مگر قصور یہ ہے کہ ایک ٹریڈ یونینسٹ باپ کے بیٹے ہیں اور لاہور یونین کے جنرل سیکرٹری اور نائب صدر رہ چکے ہیں اس لئے ان دنوں میانوالی جیل میں ۱۲۰ درجہ حرارت میں رندا اور آری چلاتے ہیں۔ اور ترکھان خانے میں مشقت کرتے ہیں۔

شاہد محمود ندیم (پروگرام پروڈیوسر)

سابق طالب علم رہنما اور صحافی۔ افسانہ نگار، دانشور اطلاقی نفسیات میں ایم ایس سی فلسفے میں ایم اے پنجاب یونیورسٹی کی مجلس ادب اور انجمن نفسیات کے صدر ٹیلی وژن میں دستاویزی فلموں کے ماہر حال ہی میں سال اقبال کے موقع پر چھ زبانوں میں اقبال کی زندگی اور نظریات پر پہلی رنگین دستاویزی فلم بنانے کا اعزاز حاصل کیا۔ جو ۸۰ ملکوں میں دکھائی گئی۔ اس کے علاوہ نوجوانوں کے پروگراموں میں خاص مقام رکھتے تھے جواں فکر، منزل، اور ٹاکرہ جیسے پروگرام کئے۔ انتخابات کے دوران لاہور سے خصوصی پروگراموں کے کوارڈینیٹر اور انتخابی نشریات کے سٹوڈیو کوارڈینیٹر رہے اسلامی کانفرنس کے دوران ایک اسٹوڈیو کے کنٹرولر ٹرانسمیشن رہے اور خصوصی پروگرام ترتیب دیتے مگر ترقی پسند سوچ اور ظلم کے خلاف نبرد آزما ہونے کے جذبے نے میانوالی جیل پہنچا دیا۔ ان دنوں ترکھان خانے میں کرسیاں بنتے ہیں اور سی کلاس کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

۱۷ تا ۲۴ جون ۱۹۷۸ء

کھیل

عبدالوحید حسینی

وسیم باری، ڈرا اسپیشلسٹ

لارڈز کا ٹیسٹ برابر ہوا تو سیریز میں دلچسپی باقی رہے گی

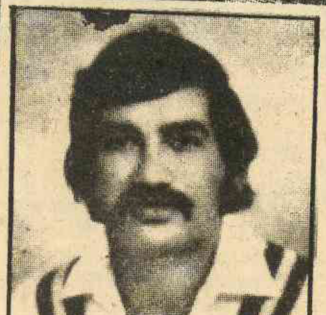

پہلے ٹسٹ میچ میں انگلستان کے ہاتھوں ایک اننگز اور ۵۷ رنز سے شکست کھانے کے بعد پاکستانی کرکٹ ٹیم کی کارکردگی پر اعتراضات کا سلسلہ جاری ہے برٹش اسپورٹس رائیٹر اے۔ ایس۔ آئی بیری کا خیال ہے کہ برمنگھم ٹسٹ میں ہارنے کا اہم سبب پاکستانی کھلاڑیوں کی لاپرواہ بیٹنگ ہے بیری کا کہنا ہے کہ پاکستانی بیٹسمینوں نے زیادہ تر گیندوں کو بیک فٹ کھیلنے کی کوشش میں اپنی وکٹیں گنوائی ہیں۔ صرف صادق محمد وہ واحد کھلاڑی تھے جنہوں نے انگلستان کے تیز رفتار باولرز کو آگے بڑھ کر کھیلا اور ان کی یہ حکمت عملی بے حد کامیاب ثابت ہوئی۔ پہلے ٹسٹ کی دوسری اننگز میں صادق نے ۷۹ رنز بنائے۔ انہیں ایل بی ڈبلیو قرار دیئے جانے کا فیصلہ بھی خاصا مشکوک تھا۔ اگر دوسرے بیٹسمین بھی صادق کی طرح آگے بڑھ کر کھیلتے تو اس بات کا امکان تھا کہ پاکستان کو اننگز سے شکست نہ ہوتی۔

ایک پاکستانی مبصر کہتے ہیں کہ ہماری ٹیم نے ایک روزہ میچز کو چھ روزہ ٹسٹ کی طرح کھیلا اور چھ روزہ ٹسٹ کو ایک روزہ میچ کی طرح کھیلنے کی کوشش کی۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ چھ روزہ ٹسٹ میں بیٹنگ کرتے ہوئے ٹائم فیکٹر کا خاص خیال رکھا جاتا۔ ہٹ اینڈ رن اسٹائل کی بیٹنگ کا کوئی جواز نہ تھا تحمل اور احتیاط سے کام لیا جانا ضروری تھا۔

ایک اور پاکستانی تبصرہ نگار کے مطابق پہلے ٹسٹ میں شکست پر جو واویلا مچایا جا رہا ہے وہ ضرورت سے

کچھ زیادہ ہے کیونکہ ۱۶ سال قبل اسی فیلڈ پر پاکستان کو ایک اننگز اور ۲۴ رن سے شکست ہو چکی ہے ۱۹۶۲ میں انگلستان کا دورہ کرنے والی ٹیم میں حنیف محمد، مشتاق سعید احمد، امتیاز، انتخاب عالم، والس متھائس، محمود حسین، نسیم الغنی اور جاوید برکی جیسے مشہور کھلاڑی شامل تھے۔ ان شہرت یافتہ کھلاڑیوں کی موجودگی کے باوجود ۱۹۶۲ میں پاکستان کو ٹسٹ سیریز میں صفر کے مقابلے میں ۴ میچز سے شکست ہوئی تھی اس سیریز میں شکست کے بعد ایم سی سی نے فیصلہ کیا تھا۔ کہ پاکستان کے خلاف ٹسٹ سیریز بجائے پانچ میچز کے صرف تین میچز پر مشتمل ہونی چاہیئے۔

انگلستان کے خلاف اب تک کھیلے جانے والے ۲۱

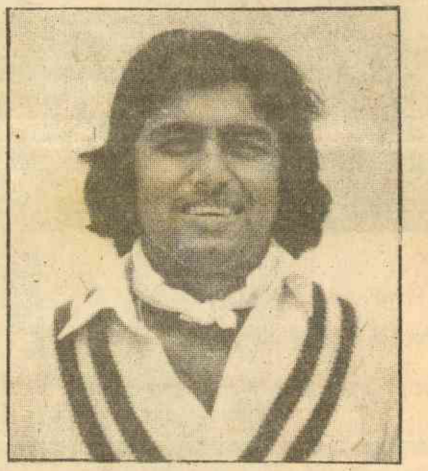

ٹسٹ میچز میں پاکستان کو صرف ایک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ یہ کامیابی ۱۹۵۴ میں اوول ٹسٹ میں حاصل ہوئی تھی جس کے ہیرو فضل محمود تھے جنہوں نے دونوں اننگز میں ۹۹ رنز دیکر ۱۲ کھلاڑی آوٹ کیے تھے۔ پاکستانی ٹیم انگلستان کے دورں میں اب تک ۹ ٹسٹ ہار چکی ہے۔ پاکستان میں کھیلے جانے والے تمام میچز سوائے ایک کے جو انگلستان نے لاہور میں ۱۹۶۲ میں پانچ وکٹ سے جیتا تھا۔ ہار جیت کا فیصلہ ہوئے بغیر ختم ہوئے۔

تقریباً کچھ ایسی ہی کیفیت لارڈز کی وکٹ کی ہے جہاں ۱۵ جون سے انگلستان اور پاکستان کے درمیان دوسرا ٹسٹ کھیلا جائے گا۔ لارڈز میں اب تک پانچ ٹسٹ کھیلے گئے ہیں جن میں چار کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ ۱۹۶۲ میں انگلستان نے لارڈز پر کھیلا جانے والا دوسرا ٹسٹ ۹ وکٹ سے جیتا تھا۔

بدقسمتی سے لارڈز پر پاکستانی ٹیموں کا اسکور اب تک مایوس کن رہا ہے۔ ۱۹۵۴ میں پاکستان نے پہلی اننگز میں صرف ۸۷ رنز بنائے تھے۔ ۱۹۶۲ میں یہ اسکور ۱۰۰ رن تھا۔ ۱۹۷۱ میں ۱۴۸ رنز اور ۱۹۷۴ میں ۱۳۰ رنز۔

لارڈز کی وکٹ کے سابقہ ریکارڈ کے پیش نظر اور پاکستانی ٹیم کی حالیہ کارکردگی کے باعث یہ توقع خارج از امکان نظر آتی ہے کہ ہماری ٹیم یہ ٹسٹ جیت سکے گی۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ وسیم باری جو "ڈرا اسپیشلسٹ" کے نام سے مشہور ہیں اپنی اس خصوصیت کو کام میں لاتے ہوئے کم از کم لارڈز کا ٹسٹ ڈرا کروا دیں تاکہ سیریز میں کچھ دلچسپی باقی رہے۔ ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ شاید آخری ٹسٹ دیکھنے کے لیے تماشائیوں کو اسٹیڈیم میں بلانے پر انعام مقرر کرنا پڑے گا۔

پہلوانوں کی ٹیم روس اور ہنگری کے دورے پر کیوں نہیں گئی؟

پاکستانی پہلوانوں کی ایک ٹیم، جسے ۱۳ مئی سے روس، ہنگری اور ایران کے ایک ماہ کے دورے پر روانہ ہونا تھا۔ اب تک منتظر ہے کہ شاید کوئی مخیر اور فن پہلوانی کا شیدائی ان کے لیے ٹکٹ اور اخراجات کا بندوبست کر دے۔

پہلوانوں کے دورے کا انتظام پاکستان اسپورٹس بورڈ کو کرنا تھا۔ لیکن عین وقت پر انہیں مطلع کیا گیا۔ کہ اسپورٹس بورڈ فنڈ کی عدم دستیابی کے باعث پہلوانوں کو روس ہنگری اور ایران بھیجنے سے قاصر ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق اسپورٹس بورڈ کے ذمے بینکوں کے دس لاکھ روپے واجب الادا ہیں۔ کھیل کے حلقوں نے اسپورٹس بورڈ کی مالی حالت پر افسوس اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایک طرف تو بورڈ قرض کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے اور دوسری جانب اس کے عہدیدار غیر ملکی دوروں پر جانے سے باز نہیں آتے۔ تازہ ترین مثال بورڈ کے ڈائریکٹر جنرل ذاکر سید کی ہے جو اپنی تمام ذمہ داریوں کو چھوڑ چھاڑ کر انگلستان میں بیٹھے کرکٹ میچز پر کمنٹری کر رہے ہیں۔

کھیل کے ان حلقوں نے اپیل کی ہے کہ اسپورٹس بورڈ کے عہدیداران کی خرچیوں کی تحقیقات کروائی جائے اور ان کے بعد کسی جواز کے غیر ملکی دورں پر جانے کا سلسلہ بند کیا جائے۔ اپیل میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ پہلوانوں کو جلد از جلد روس، ہنگری اور ایران کے دورے پر بھیجا جائے جہاں میزبانوں نے اس دورے کے لیے بڑے بہانے پر انتظامات کر رکھے ہیں۔

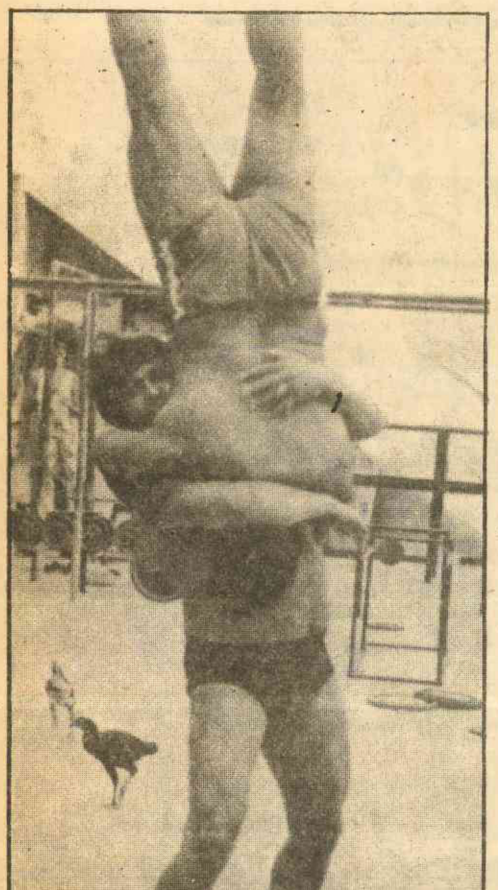

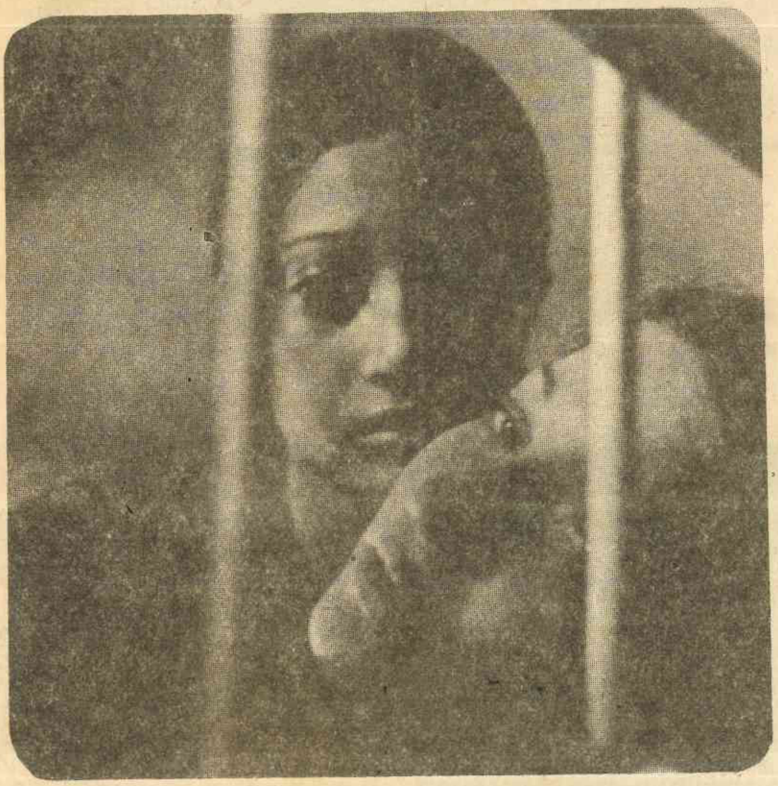

تاشقند کا فلمی میلہ

عام ڈگر سے ہٹ کر ہوتا ہے

تاشقند میں تیسری دنیا کا پانچواں فلمی میلہ ختم ہو گیا ہے جس میں پاکستان سمیت ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے متعدد ملکوں نے شرکت کی۔ پاکستانی وفد کے قائد جناب اصغر بٹ تھے۔

اور اس وفد میں شگفتہ، کویتا، ان کی والدہ مہتاب بانو، ہدایت کار ایس سلیمان، آغا طالش اور جمال خان شامل تھے۔

"امبر، پیار کا وعدہ، مہمان، مجھے گلے لگا لو" نے تاشقند کے فلمی میلے میں پاکستان کی نمائندگی کی، اس فلمی میلے کا دستور یہ ہے کہ ایک برس ماسکو میں منعقد ہوتا ہے اور دوسرے برس تاشقند میں اس سال تاشقند کی باری تھی۔

"تاشقند میں اس سے پہلے تیسری دنیا کے ممالک کے چار میلے منعقد ہو چکے ہیں پہلا میلہ ۱۹۶۸ء میں منعقد ہوا تھا جس میں انچاس ملکوں کی ایک سو پانچ فلمیں نمائش کے لئے پیش کی گئی تھیں۔ اور اس میں ۲۴۷، مہمان شریک ہوئے تھے دوسرا فلمی میلہ جو ۱۹۷۲ء میں منعقد ہوا۔ اس میں ۴۲ ملکوں کی ۱۲۶ فلمیں نمائش کے لئے پیش کی گئیں۔ اس میلے میں تین سو فلم ساز اور فلمی صحافی شریک ہوتے ۱۹۷۴ء کے فلمی میلے میں شریک ہونے والے ملکوں کی تعداد ستر تک پہنچ گئی۔ اس میلے میں ۱۷۶ فلمیں نمائش کے لئے پیش ہوئیں اس میلے میں ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے فلمی نمائندوں نے پہلی بار اپنی فلمیں دکھائی۔ اس میلے میں اقوام متحدہ اور یونیسکو کے نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ تاشقند کے چوتھے فلمی میلے کو جو ۱۹۷۶ء میں منعقد ہوا۔ پہلی بار سرکاری طور پر ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے لوگوں کا میلہ قرار دے دیا گیا اس میں تینوں براعظموں سے بہتر ملکوں نے شرکت کی۔ اور اپنی ۲۱۰ فلمیں نمائش کے لئے پیش کیں یورپ اور شمالی امریکہ ۲۵ مہمانوں سمیت چار سو فلم ساز اور صحافی اس میلے میں شریک ہوئے اور اس سال منعقد ہونے والے پانچویں فلمی میلے میں فلموں اور شرکاء کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ اس موقع پر اس میلے کی دسویں سالگرہ بھی منائی گئی"۔

میلے میں نمائش کے لئے پیش کی جانے والی فلموں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ظلم و ناانصافی کے خلاف لوگوں کے احتجاج ایک بہتر مستقبل کے لئے اُن کے خوابوں اور عوام کی انقلابی جدوجہد اور جوش وولولے

کو مربوط کرتی ہیں پاکستان کے دکھی اور مظلوم کسان بنگال کے غریب مچھیرے اور ارجنٹائن کے مزدور کو، قحط زدہ بینیگالیوں اور ذات پات کے بندھنوں کے خلاف لڑنے والے ہندوستان کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہیں اور اُن کے درمیان یک جہتی کی فضا پیدا کرتی ہیں ۔ درجنوں نئے ملک سیاسی نقشے پر اُبھر چکے ہیں اور وہاں کے عوام اپنی قومی ثقافت کے احیاء میں مصروف ہیں ان کی فلمی صنعت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے یہ میلہ انگولا۔ ایتھوپیا، کوسٹاریکا اور نیپال کی فلمی صنعت کے علاوہ فلسطین کے محاذِ آزادی کے فلمی کارناموں سے بھی روشناس کراتا ہے ۔

ریڈیو ٹیلی ویژن پر دودھ والوں کا قبضہ

کراچی اسٹیشن کے جنرل منیجر زمان صاحب اسٹیشن کے تمام ملازمین میں بہت مقبول ہیں۔ انکی مقبولیت پر تبصرہ کرتے ہوئے چند پروڈیوسرز کا کہنا ہے "وہ اصول پرست آدمی ہیں ان کی کامیابی کا بڑا راز یہی ہے کہ ان کے ماتحت ہمیشہ خوش رہتے ہیں انہیں لوگوں سے کام لینا اور انہیں مطمئن رکھنے کا گر آتا ہے۔"

جولائی سے شروع ہونے والی نئی سہ ماہی میں ایک بار پھر ڈرامہ نگار حسینہ معین اور پروڈیوسرز محسن علی و شیریں خان کا تکون نئی سیریز کا آغاز کر رہا ہے ۔

اطہر شاہ خان عرف جیدی کی نئی مزاحیہ سیریز "آمنے سامنے" پروڈیوسر آفتاب عظیم پیش کریں گے ۔

ڈراموں کا سلسلہ وار پروگرام "محور" کی نئی سہ ماہی میں جگہ نہیں ہے ۔

پروڈیوسر قاسم جلالی کی سیریز "زندگی بندگی" نہ صرف تعطل کا شکار ہے بلکہ مستقبل میں بھی اسکے جاری ہونے کے امکانات نہیں ہیں۔ اس کی ریکارڈ شدہ ایک قسط کو دیکھنے کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ ڈرامہ کا اصل مقصد واضح نہیں ہے۔ یہ قسط بہت ممکن ہے ٹی وی تھیٹر کے سلسلے میں پیش کر دی جائے ۔

محور کے سلسلے میں شاہد کاظمی کی کہانی "خوابوں کا مسیحا" قاسم جلالی اور کاظم پاشا اگلے ہفتے پیش کریں گے اس ڈرامے میں آرٹسٹ کا کردار کرنے والے عبیداللہ زبیر کو شکایت ہے کہ دو ہفتوں سے ان کی قسمت ساتھ نہیں دے رہی اور لیٹ ہو جانے کے سبب انہیں چھوٹے کرداروں پر گزارا کرنا پڑ رہا ہے ۔

کراچی شہر میں ہے کوئی ہمت والا جو کراچی ٹی وی اسٹیشن کے سات سو ملازمین کے کھانے پینے کے بندوبست کا ٹھیکہ لے۔ کہ ان کی موجودہ کینٹین کے مالک نے رختِ سفر باندھ لیا ہے ۔

ٹی وی کے پروڈیوسر جو
جوڈو کراٹے کے ماہر ہیں

تاجدار عادل ! آجکل نیلام گھر میں ان دوستوں سے تعلقات استوار کر رہے ہیں جن سے ان کی سات رنگ کے دوران گاڑھی چھنتی تھی -

---

دبلے پتلے پروڈیوسر عارفین کے متعلق بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ وہ نہ صرف جوڈو کراٹے کے داؤ جانتے ہیں بلکہ براؤن بیلٹ ہولڈر بھی ہیں -

---

گلوکار شوکت علی اور آئرن پروین آجکل اپنی اپنی ازدواجی زندگی کے خاتمے کی کوششوں میں مصروف ہیں تاکہ نئے بندھن میں بندھ سکیں - اس کا ذخیر کے لئے دونوں گلوکاروں نے گانوں کی ریکارڈنگ میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے کہ جلد از جلد مطلوبہ رقم فراہم کر کے اپنے شریک زندگیوں سے چھٹکارہ پا سکیں، شوکت اور آئرن پروین ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور ان کی موجودہ شادیاں گھریلو نوعیت کی ہیں -

---

غزل گائیکی کی بے تاج ملکہ منی بیگم جس کا داخلہ ریڈیو، ٹی وی میں ممنوع ہے - اس کی غزلیں ریڈیو سے دوبارہ نشر ہونا یقیناً پالیسیوں میں بہت بڑا انقلاب سمجھا جا رہا ہے -

---

یہ بات پتہ نہیں ریڈیو، ٹی وی والوں کے لئے اہم ہے یا پبلسٹی اداروں کے لئے کہ اسوقت دونوں اداروں سے پیش ہونے والے تمام دلچسپ، مقبول اور بڑے پروگرام کسی نہ کسی دودھ کمپنی کی جانب سے پیش کئے جا رہے ہیں - بالفاظِ دیگر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان اداروں پر "گوالوں" کا قبضہ ہے -

---

کشمیر روڈ پر پی آئی اے اسپورٹس کمپلکس لگتا ہے میلوں کا مستقل ٹھکانہ بن گیا ہے ابھی میلہ یونیک دن کی یادیں تازہ ہی ہیں کہ اسی میلے کے آرگنائزر اذمیر ایسوسی ایٹس والے ظفر صدیقی سے ۵۴ روزہ صنعتی نمائش کا آغاز کر رہے ہیں - اس کے باوجود کہ انھیں گذشتہ میلے میں سوائے تجربہ کے خسارہ ہی خسارہ رہا - بقول ان کے وہ ملک و قوم کے مفاد میں پھر رسک لینے پر مجبور ہیں.

بقیہ سرورق

رہی ہے۔ قومی اتحاد میں شمولیت کے دوران بھی انکا یہ "منی اتحاد" برقرار تھا۔ اور قومی اتحاد میں انتخابات کے لئے ٹکٹوں کی تقسیم کے وقت جمعیت اور تحریک کے لئے ایک ساتھ کوٹہ مقرر کیا جاتا تھا۔ اصغر خان نے قومی اتحاد سے نکلنے کے بعد اس کے لئے متحدہ محاذ کی اصطلاح استعمال کی، شاہ احمد نورانی بھی قومی اتحاد سے نکلنے کے اس عمل کے دوران یہی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ شاہ احمد نورانی کو یہ علم ہے کہ انکی جماعت کبھی یکا و تنہا اقتدار حاصل کر سکتی ہے اور نہ اسکی پوری طرح اہل ہے۔ اس لئے وہ اصغر خان کو سیاسی طور پر اپنا سربراہ تسلیم کر کے انکے ساتھ اقتدار میں شریک ہونے پر صاد کئے ہوتے ہیں۔ انکے لہجے اور آواز میں تبدیلی کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ اصغر خان کے ہم آواز ہیں اور سیاست میں اپنا پورا مستقبل انہیں کے ساتھ جوڑتے ہیں۔

اصغر خان کی جنرلوں سے ملاقات انکی سیاسی حکمت عملی کے لئے ایک موڑ تو بن سکتی ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ فوری انتخابات اور منتخبہ حکومت کے قیام کو اپنی سیاست کی بنیاد بنائیں گے۔ انکی آواز کی شدت میں کمی یا زیادتی ممکن ہے لیکن اسے ترک کرنا ناممکن ہے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ پاکستان کے عوام کی یہی خواہش ہے اور قومی سطح پر انکی ہمدردیاں وہ اسی نعرے کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں، انہوں نے اپنی یہ آواز اگر بلند کی تو عوام کی بڑی تعداد اس معاملے میں ان کی ہم آواز بھی ہو سکتی ہے۔

بقیہ کراچی

نے اس کے خلاف صنعتی تعلقات کے کمیشن میں عذرداری داخل کر دی۔ یہ بات صالحین کو بالکل پسند نہ آئی۔ چنانچہ آپریشن کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ۱۰ رجون کو صدر نے اپنے آئینی اختیارات سے کام لے کر پوری باڈی معطل کر دی۔ اور اسی شام کو مولوی رفیق گروپ نے صدر کو اپنے عہدے سے ہٹا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے آپریشن کا آغاز ہوا۔ ڈرائیور فضل الرحمان جو صدر گروپ کا تھا، صالحین نے اسے پیٹ ڈالا اور دوسرے کئی لوگوں کو زخمی کیا اس کے ساتھ ہی جماعتی صالحین نے پی آئی اے میں کام بند کرانے کی کوشش کی، جسے ایئر ویز یونین اور دوسرے لوگوں نے ناکام بنا دیا۔ انتظامیہ نے پولیس طلب کر لی۔ لیکن انڈسٹریل ریلیشن منیجر نے اس کیس کو دبانے کی کوشش کی۔ اس سے قبل بھی جماعتی صالحین نے ایک جونیئر آفیسر مسٹر مبشر احمد کو اس کمرے میں بری طرح زدوکوب کیا تھا۔ لیکن انڈسٹریل ریلیشن منیجر نے اس کیس کی غلط تصویر پیش کر کے دبا دیا۔

بات ۱۲ رجون تک پہنچی اور اس دن پیاسی نے پولیس کی موجودگی میں چھ آپریشن کئے۔ پیاسی کے محمد علی بٹ، مسٹر عباس، شبیر علی، فضل دین ڈرائیور قابل ذکر لوگ ہیں جو اس آپریشن کا نشانہ بنے۔ جب بات بہت آگے بڑھ گئی تو انتظامیہ نے اس کی شدت کو محسوس کیا اور صنعتی تعلقات کے کمیشن کو اس میں مداخلت کی درخواست کی کہ وہ یہ دیکھے کہ ان دونوں گروپوں میں کون سا نمائندہ گروپ ہے۔ سینئر کمیشن نے اس سلسلے میں فیصلہ نہیں دیا۔ لیکن ان گروپوں کے اعتبار سے سیاسی جائزہ زیادہ مفید نتائج سامنے لائے گا۔

گو عصمت جاوید بھی جماعت کے دور کے حلقوں سے ہی تھے لیکن وہ ہر معاملہ میں جماعت کی مداخلت کے خلاف تھے۔ ان کے ساتھ جو گروپ تھا اس نے کھلم کھلا اصغر خان اور میاں نورانی کے ساتھ اپنی وابستگی کا بھی اعلان کر دیا۔ ڈرائیور فضل الرحمان جسے دو تین بار گھیر کر مارنے کی کوشش کی گئی۔ پچھلی تحریک کے دوران میاں شاہ احمد نورانی کے ڈرائیور اور باڈی گارڈ کی حیثیت میں ان کے ساتھ تھا چنانچہ جماعت والے اوپر کے سیاسی اختلافات کو بھی یہاں استعمال کر رہے ہیں۔ دوسری طرف اصغر خان کے حامی اب کھل کر عصمت جاوید کی حمایت کرتے ہیں۔

ان حالات میں انتظامیہ بھی مختلف صورتوں میں مختلف گروہوں کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ لیکن انڈسٹریل ریلیشن ڈیپارٹمنٹ جس کا کام تمام مزدوروں کے جائز حقوق کی نگرانی اور رواداری ہے اس کے منیجر کھل کر یک طرفہ طور پر جماعتی عناصر کا ساتھ دے رہے ہیں اور اس کشیدگی کو بڑھاتے ہیں ان کا بڑا کردار ہے۔ وہ کھل کر خود کو اس گروپ سے وابستہ بتاتے ہیں جس سے یہ خدشہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ وہ حالات جنہوں نے پی آئی اے کو اس بدامنی تک پہنچایا ہے، آگے کہاں تک جائیں گے۔ ٹری انتظامیہ خود کو اس سیاست میں ملوث نہیں کر رہی۔ چنانچہ یوں لگتا ہے کہ اگر افسروں کو ورکرز کی سیاست میں حصہ لینے سے نہ روکا گیا تو پی آئی اے کی لاجواب پروازوں کو باکمال لوگوں کی نذر ہونے سے کوئی نہ بچا سکے گا۔

بقیہ اسیر صحافی

ہے۔ ہماری رہائی کے احکامات کے بارے میں سب سے پہلے انہوں نے ہمیں اطلاع دی تھی اور کہا تھا کہ میں نے سنا ہے کہ آج آپ لوگوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ جیل میں قیمتی صاحب کی جتنی عزت ہوتی ہے اور جو مقام حاصل ہے وہ جیل کے باہر بھی شاید کم ہی لوگوں کو نصیب ہو۔ سینٹرل جیل فیصل آباد ہی کی سی کلاس میں ایک کوٹھڑی ایسی بھی ہے جس میں سوائے ائیر کنڈیشنڈ کے ہر چیز موجود ہے دریافت کرنے پر جو تفصیلات معلوم ہوئیں ان کا اظہار ضروری نہیں

سنٹرل جیل فیصل آباد ہی میں ہماری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی۔ جو چودہ سال قید سخت کاٹنے کے بعد سپریم کورٹ سے "باعزت" بری ہو رہا تھا۔ وہاں ایک بڑے میاں ایسے بھی ملے جنہیں بغیر پاسپورٹ پاکستان میں داخل ہونے کے جرم میں قید سخت کی سزا ہوئی تھی اور آج پانچ برس سے وہیں مقیم ہیں یہ اور اس قسم کے سینکڑوں ایسے کیس ہیں جن کے بارے میں سن کر بے اختیار ہمارا دل رو دیتا تھا مگر ہم بھی کیا کرتے ملک میں احتساب ہو رہا ہے۔ اس وقت کسی کو فرصت ہے ان انسانی مسائل کی طرف دھیان دینے کی۔

بڑے شہروں میں

"معیار پبلیکیشنز" کے تقسیم کنندگان

مندرجہ ذیل شہروں میں معیار کی مطبوعات ہمارے ان نیوز ایجنٹ حضرات کے ہاں دستیاب ہے۔ پرچہ گھر پر پہنچانے کا انتظام بھی ہے۔ پرچے کے حصول میں دِقّت ہو تو اِن حضرات سے رابطہ قائم کیجئے۔ مزید دِقّت ہو تو ہمیں براہِ راست لکھئے۔

"معیار پبلیکیشنز" پوسٹ بکس ۳۱۹۵، کراچی ۲۹۔

پشاور
بزنس کمپنی چوک یادگار

کراچی
فاروق نیوز ایجنسیز، ریگل چوک۔

لاہور
اے رحمٰن نیوز ایجنسی
۱۔ فین روڈ

راولپنڈی
افضل نیوز ایجنسی
ڈی اے وی، کالج روڈ۔

کوئٹہ
میسرز گوشۂ ادب
سرکلر روڈ۔

ملتان
ملک نیوز ایجنسی
ملک پلازہ، عظمت واسطی روڈ

لائلپور
محمد اسحاق، نیوز پیپر ایجنٹ
کچہری بازار

حیدرآباد
میسرز سلیمان برادرز
نیوز پیپر ایجنٹ

سکھر
حسینی بک ڈپو
گھنٹہ گھر

میرپور خاص
سندھ کتاب گھر
اسٹیشن چوک

لاڑکانہ
پاکستان بک ڈپو

سیالکوٹ
ملک اینڈ سنز
نیوز پیپر ایجنٹ

سرگودھا
میسرز اسٹینڈرڈ بک اسٹال

بہاولپور
کیپٹل نیوز ایجنسی

بدین
غفور نیوز ایجنسی

جہلم
بٹ نیوز ایجنسیز

گوجرانوالہ
ذوالفقار احمد صمدانی
نیوز پیپر ایجنٹ

رحیم یار خان
چوہدری امانت علی
نیوز پیپر ایجنٹ

خیرپور
مکتبہ حیدری
حسینی چوک

بھکر (ضلع میانوالی)
ذاکر حسین نیوز ایجنٹ

گلگت
پیرزادہ محمد حسین شاہ
نیوز پیپر ایجنٹ

ڈیرہ اسماعیلخان
راجہ برادرز
نیوز ایجنٹ

گجرات
نذر نیوز ایجنسی
اقبال گنج

منڈی بہاؤالدین
ملت نیوز ایجنسی

ٹھٹھہ
شمس بک اسٹال

مانسہرہ
بلال نیوز ایجنسی

خانیوال
کتب خانہ صدیقیہ
کچہری بازار

ڈیرہ غازیخان
شمیم نیوز ایجنسی

سانگھڑ
ہمدرد لائبریری

جھنگ
شیخ محمد حسین
نیوز ایجنٹ

کیمبل پور
خزینۂ علم و ادب
نیوز پیپر ایجنٹ

ڈڈیال (آزاد کشمیر)
راجہ فضل الرحمٰن
نیوز ایجنٹ

چمن
نشاط نیوز ایجنسی

سامارو (ضلع تھرپارکر)
شوقین نیوز ایجنسی

اسکردو (بلتستان)
رسول جو حسن جو
نیوز پیپر ایجنٹ

اوتھل (ضلع لسبیلہ)
شاہد نیوز ایجنسی

وہاڑی (ملتان)
وہاڑی نیوز ایجنٹ

میرپور (آزاد کشمیر)
اعظم نیوز ایجنسی

ایبٹ آباد
پاکستان نیوز ایجنسی

Telephone: 435673

'MEYAAR PUBLICATIONS'

POST BOX 3195, KARACHI-29

جد وجہد جاری

رہے گی!

منہاج برنا

نثار عثمانی